روزانہ

چوبیس ۲۴ گھنٹے

کیوں کر رہا جائے؟

خوب سے خوب تر اور
کامیاب و کامران زندگی کے لئے



میری لائبریری

میری لائبریری میں سلسلہ نفسیات کی کتابیں

جینے کی اہمیت ، لن یوتانگ

میٹھے بول میں جادو ہے ، ڈیل کارنیگی

پریشان ہونا چھوڑ دیجئے } ڈیل کارنیگی
جینا شروع کیجیے

گفتگو اور تقریر کا فن ، " "

مانیں نہ مانیں ، " "

زندگی اور عمل ، ڈاکٹر ماردن

جنس کا نفسیاتی پہلو ، کینتھ واکر ، پیٹر فلیچر

جنس کا جسمانی پہلو ، کینتھ واکر

زندگی کے موڑ پر ، چالیس سچی آپ بیتیاں

شادی اور کامیابی ، یوسٹس چیسر

نفسیات کی روشنی ، چند خیال افروز مضامین

نفسیات اور عمل ، مشاہیر مغرب کے مضامین

روزمرہ نفسیات ، اکرم طاہر

ترقی کی راہیں ، محمد نعمان ساجد

دولت نامہ ، محمد اکرم طاہر

انتالیس بڑے آدمی ، ڈیل کارنیگی

لباس کا مسئلہ اور نیوڈی ازم ، احمد خان اشرف

بچے اور ان کی تعلیم و تربیت ، صدیقی گلزار احمد

روزانہ چوبیس (۲۴) گھنٹے کیسے زندہ رہا جائے

مصنف آرنلڈ بینیٹ

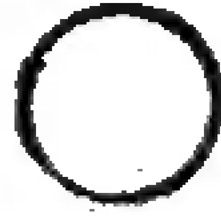
مترجم سلیم اختر

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

ناشر : بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر
مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲

طابع : اتحاد پرنٹنگ پریس لاہور

طبع دوم : پہلی بار میری لائبریری میں ۱۹۷۹



"صبح دم جیسے ہی آپ نے نیند سے بے دار ہو کر انگڑائی لی تو اسی وقت چھومنتر سے آپ کے بٹوے کو نئی اور سنہری اشرفیوں کی مانند چوبیس گھنٹوں سے بھر دیا جاتا ہے۔ یہ چوبیس گھنٹے آپ کی زندگی سے وابستہ اس کائنات کا ایک حصہ ہوتے ہیں جو ابھی شرمندۂ تخلیق نہیں ہوئی۔ آپ سمجھ گئے میرا مطلب؟ یہ چوبیس گھنٹے آنے والے وقت کے ہیں۔ یہ آپ کا مستقبل ہے اور آپ ان کے بلا شرکت غیرے تنہا مالک ہیں۔"

شذرہ ناشر

میری لائبریری کی سبھی کتابیں اپنے اپنے مقام پر نہایت درجہ مفید اور اہم ہیں' تاریخ و سوانح کا سلسلہ ہے تو اپنی جگہ نفسیات و خود آگہی کا سلسلہ اپنی جگہ' تنقید' ادب' افسانہ' ناول' شکار' مزاح' طنز' لطائف ہیئے کہ شعری انتخابات کو لیجیے یا افسانوی انتخابات اور دوسرے سلسلوں کو' ایک سے ایک' مزیدار' معیاری اور مستند ہے۔

آرنلڈ بینٹ کی یہ کتاب' "ہو ٹو لو آن ٹوئنٹی فور آورز اے ڈے" (روزانہ چوبیس گھنٹے کیسے زندہ رہا جائے) کے مطالعہ کی سفارش ڈیل کارنیگی نے اپنی کتاب "گفتگو اور تقریر کا فن" میں کی ہے' اور کارنیگی کی یہ کتاب اُس کی دوسری کتابوں میں زیادہ مقبول اور مفید ہے' اساتذہ اپنے طلبا کو سالانہ امتحانات میں سبقت لے جانے کے لیے اس کتاب کی سفارش کرتے ہیں' عام آدمی اس کتاب کے نام ہی سے متاثر ہو کر اس کے مطالعے کے لیے تیار ہو جاتا ہے نتیجتہً جتنے لوگ بھی قائل اور متاثر کرنے کے لیے "گفتگو اور تقریر کا فن" کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں وہ زندگی میں پہلی بار کسی بڑے ہمدرد اور خیر خواہ سے ملاقات کرتے ہیں اور پھر کارنیگی کی سفارش پر اس کتاب کے حصول کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

اِس سے پہلے یہ کتاب "صبح کرنا شام کا" کے نام سے چھپی تھی' لیکن ادارہ' میری لائبریری' نے اسے نئے نام سے چھاپا ہے۔

ہمیں پختہ یقین ہے کہ بہتر زندگی گزارنے کا متمنی اب کوئی شخص اس مفید کتاب کے مطالعہ سے محروم رہنا گوارا نہ کرے گا۔ نیز کتاب کے مفید ہونے پر اپنے احباب میں بھی اس کے مطالعہ کی سفارش کرنا نہ بھولے گا۔

آپ کا خیر طلب
بشیر احمد چوہدری

لاہور ۲۷ دسمبر ۱۹۷۴ء

ترتیب

پیش لفظ

یہ طبع سوم کا پیش لفظ ہے!

پیش لفظ کو نام کی رعایت اور رواج کی بنا پر اصل کتاب کے آغاز سے پہلے ہی جگہ ملنی چاہیے لیکن مناسب یہی ہے کہ آپ اسے کتاب کے اختتام پر پڑھیں۔

اس مختصر سی کتاب کی اشاعت کے بعد کثیر التعداد اصحاب نے اس کے بارہ میں اپنی رائے کے اظہار کے لیے مجھے خطوط لکھے۔ اس پر تبصرے کیے گئے۔ بلکہ بعض تبصرے تو ایسے تھے جو طوالت میں اس کتاب سے کسی صورت سے بھی کم نہ تھے۔ ان خطوط اور تبصروں میں ایک چیز مشترک تھی کہ کسی نے بھی اس کتاب اور اس کے نفسِ موضوع کے خلاف کچھ نہ کہا تھا۔ البتہ بعض اصحاب نے میرے اسلوب اور اندازِ تحریر پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے غیر ثقہ اور غیر سنجیدہ قرار دیا۔ لیکن کیونکہ میرا خیال اس کے برعکس ہے اور میں اپنی بات کہنے کے انداز کو غیر سنجیدہ نہیں سمجھتا اس لیے میں اس اعتراض سے قطعاً متاثر

نہ ہوا۔ اور اگر ایک آدھ امر پر کڑی تنقید نہ کی گئی ہوتی تو میں اپنی جگہ یہ سوچ کر مگن رہتا کہ یہ کتاب ہر قسم کی خامیوں سے مبرّا ہے۔ یہ اعتراض۔ جو نسبتاً زیادہ سخت تھا۔ تبصرہ نگاروں نے نہیں بلکہ کئی مراسلہ نگاروں نے کیا تھا۔ کیونکہ ایسے لوگ ہمیشہ خلوص اور نیک نیتی سے لکھتے ہیں اس لیے میں ان کی تشفی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ صفحہ نمبر ۵۰ کا مطالعہ کریں تو آپ کو یہ احساس ہو جائے گا کہ خود مجھے بھی اعتراض کیے جانے کی توقع تھی۔ وہ پیراگراف جس نے لوگوں کو احتجاجی مراسلے تحریر کرنے پر مجبور کیا وہ یوں ہے۔

" ایسی مثالوں کی اکثریت ہے جن کی صورت میں وہ (یعنی ایک عام آدمی) اپنے کاروبار یا کام کے لیے کوئی خاص سرگرمی اور جوش نہیں محسوس کرتا۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اسے ناپسند نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنے کام کو ۔۔۔ حتی الامکان تاخیر کے بعد ایک قسم کی بے دلی اور اکتاہٹ سے شروع کرتا ہے اور اپنے مخصوص حالات کے تحت جب وہ اسے جلد از جلد ختم کرتا ہے تو وہ خود کو بے حد مسرور اور مطمئن محسوس کرتا ہے۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے دوران اس کے قویٰ کبھی بھی اپنی انتہائی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں ۔۔۔ ایسی کارکردگی جسے ہم " فل ہارس پاور " قرار دے سکیں "

میرے مراسلہ نگاروں نے بصد خلوص مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ ان کاروباری حضرات سے قطع نظر جو سونے کی گنگائیں بہتے ہیں ۔۔ جن کی سماجی حیثیت ارفع ہے اور جو معاشی لحاظ سے ایک سنہرا مستقبل

رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دوسروں کے ملازم ہیں۔ جن کی تنخواہیں کم اور مشاہرے ناکافی ہیں اور جو تمام عمر گزارنے کے باوجود بھی اتنی ترقی نہ کرسکیں کہ وہ معاشی لحاظ سے آسودہ ہوکر صحیح معنوں میں فارغ البال ہوسکیں گے۔

لیکن اس کے باوجود بھی یہ لوگ اپنے کام سے پیار رکھتے ہیں اور تمام کاروباری امور کو پوری دلجمعی اور دلچسپی سے سرانجام دیتے ہیں ـــــ وہ کبھی اپنے فرائض کی بجاآوری میں کوتاہی نہیں برتتے ـــــ وہ کبھی دفتر زیادہ سے زیادہ دیر کرکے آنے اور زیادہ سے زیادہ جلدی جانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں ـــــ یہ وہ لوگ ہیں جو صحیح معنوں میں اپنے روزمرہ کے دفتری کام میں اپنا تن من لگادیتے ہیں اور جب شام کو وہ تھک کر چور چور ہوتے ہیں تو یہ تھکن مصنوعی نہیں ہوتی بلکہ یہ اس خلوص اور محنت کی پیدا کردہ ہوتی ہے جس سے وہ کام میں اپنی روح سمو دیتے ہیں۔

میں اسے تسلیم کرنے کو تیار ہوں ـــــ بلکہ میں اسے تسلیم کرتا ہوں میں اس حقیقت کو جانتا ہوں بلکہ میں ہمیشہ سے اس حقیقت کو جانتا چلا آیا ہوں۔ کیونکہ لندن اور بعض دیگر علاقوں میں ـــــ میں نے خود بھی کئی سال کی مدت دوسروں کی ملازمتوں میں گزاری ہے اور میں اس حقیقت سے باخبر ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ میرے دوست احباب اور ہم چشموں میں سے ایک مخصوص تعداد ایسے اصحاب پر مشتمل تھی جو واقعی اپنے کام کو خلوص، محنت، شوق اور دیانتداری سے سرانجام دینا پسند کرتے تھے۔ اور نہ ہی یہ امر میری نگاہوں سے روپوش رہ سکا کہ اپنے فرائض کی بجاآوری میں صرف کیا گیا ایک ایک لمحہ ان کے لیے

"زندگی" اور "نشاطِ زندگی" کے مترادف تھا۔ لیکن اس سے میرا یہ عقیدہ نہ بدل سکا کہ ایسے خوش قسمت اور مسرور افراد (--- ان کی مسرت ان کے اندازوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ مسرت خالی اور کھوکھلی نہیں ہوتی ہے بلکہ طمانیت اور ذہنی سکون کی پیدا کردہ ہوتی ہے) بہت کم ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد تو آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ دگرنہ اکثریت ہمیشہ ان کے برعکس ہی ہوتی ہے۔

اسی طرح میرا یہ عقیدہ بھی برقرار رہا کہ عام محنتی اور اچھے کاروباری حضرات کی اکثریت (ایسے کاروباری حضرات جو اپنے کام کے متعلق کچھ نصب العین اور ارفع تصورات رکھتے ہیں) جب گھر جاتی ہے تو وہ تھکن سے نڈھال نہیں ہوتی اور اسی لیے ابھی تک میں اسی عقیدہ کا حامل ہوں کہ وہ اپنے کام کے لیے صرف اتنی ہی محنت اور وقت صرف کرتے ہیں جو معقول آمدنی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ اپنے پیشہ میں اتنی ہی دلچسپی لیتے ہیں جتنی اس پیشہ یا کاروبار کو چلانے کے لیے ناگزیر ہو۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اس تمام سلسلہ سے ہی بور ہوتے ہیں۔

تاہم میں اتنا ضرور تسلیم کروں گا کہ محنتی اور کام سے محبت کرنے والے حضرات کی اقلیت ایسی نہیں کہ اسے نظرانداز کر دیا جائے بلکہ اپنی خصوصیات کی بنا پر وہ اتنی اہمیت کی مالک ہے کہ اس پر بھی مخصوص توجہ صرف کی جا سکتی ہے۔ اور مجھے اپنی کتاب میں اس طبقہ کو بالکل ہی نظرانداز نہ کر دینا چاہیے تھا۔ محنتی اور جفاکش حضرات پر مشتمل اس اقلیت کی تمام مشکلات کو میرے ایک مراسلہ نگار نے یوں قلم بند کر دیا ہے

"دیگر افراد کی مانند میرے دل میں بھی ترقی اور راہِ حیات میں
آگے بڑھ کر گامزن ہونے کا جذبہ موجود ہے لیکن میں
یہ گزارش کروں گا کہ جب میں شام کے ساڑھے چار بجے
گھر پہنچتا ہوں تو میں اتنا تازہ دم اور چست و چالاک نہیں
ہوتا۔ جتنا آپ نے اپنی کتاب میں ہم لوگوں کے بارہ
میں تصور کر رکھا ہے"

میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ اقلیت ـــ جو اپنے روزمرہ کے کاروباری امور کی محنت، سرگرمی اور جوش سے بجا آوری کرتی ہے ۔ اِس قابلِ افسوس اکثریت سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو اپنے کاروباری دن کو مردہ دلی اور احمقانہ انداز سے گزارتی ہے ۔ اس لیے موخرالذکر کی نسبت اوّل الذکر کو "زندگی بسر کرنے" کے لیے نصیحتوں اور مشوروں کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں ہے ۔ کیونکہ اتنا تو ہے کہ جب تک وہ لوگ اپنے دفتروں میں اپنے کام کاج میں مصروف رہتے ہیں اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں "زندہ" ہوتے ہیں اور اپنے دفتری دن ـــ (آٹھ گھنٹے سمجھ لیجئے) ـــ کے دوران ان کے ذہنی اور جسمانی قوتیں اپنی انتہائی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور وہ اپنی صلاحیتوں کو حتی المقدور بروئے کار لانے کی سعی کرتے ہیں ـــ اور عموماً یہ سعی لاحاصل نہیں ثابت ہوتی ہے ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دن کے باقی آٹھ گھنٹوں میں وہ اس زندگی کا ثبوت نہ دے پاتے ہوں، ان میں کوئی نظام اور ضابطہ نہ ہو ـــ اور کسی معقول نظامِ اوقات سے عاری یہ آٹھ گھنٹے محض یوں ہی بلا مقصد چھوٹی چھوٹی

اور فضول اور لایعنی باتوں پر ہی ضائع ہو جاتے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی یہ بہت اچھے ہیں۔ کیونکہ دن کے چوبیس گھنٹے ضائع کرنے سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ انسان کم از کم آٹھ گھنٹوں کو تو "زندہ" انسانوں کی طرح زندگی کی تمام سرگرمی جوش اور محنت سے بسر کرے۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کا ثبوت نہ دینے سے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ انسان کچھ دیر کے لیے تو زندگی کی رمق اور چمک دمک دکھا جائے۔ اس کتاب میں جس المناک حالت کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی گئی ہے وہ اس انسان کی زندگی کا المیہ ہے جو نہ تو کاروبار اور دفتر میں کوئی کارگزاری کر دکھانے کا متمنی ہے اور نہ ہی کاروباری زندگی سے علیحدہ ہو کر وہ کسی مقصد کو پانے اور نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ ایسے ہی حضرات کے لیے یہ کتاب تحریر کی گئی ہے اور دراصل یہی لوگ میرے مخاطب ہیں۔ لیکن دوسرا اور زیادہ خوش بخت آدمی یوں کہتا ہے "گو میرا روزانہ کا لائحہ عمل اس سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن پھر بھی میں اس لائحہ عمل پر سبقت لے جانا چاہتا ہوں۔ میں زندگی کا ثبوت دے رہا ہوں۔ مگر میں اس سے بھی زیادہ اور بھرپور طریقہ سے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے دفتری کام کے اثبار پر دوسرے دن کے کام نہیں کر سکتا ہوں۔"

حقیقت یہ ہے ––– اور بحیثیت مصنف مجھے اس حقیقت کو پہلے سے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ میری یہ کتاب ان لوگوں کے لیے سب سے زیادہ موثر اور باعث کشش ثابت ہو گی جو پہلے سے ہی اپنی زندگیوں کو ایک اچھے انداز پر بسر کرنے کے جذبہ کے تحت اپنی روزمرہ کی زندگی اور اس سے

وابستہ تمام امور میں حتی الامکان دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ انسان جس نے جام زیست سے چند جرعے چکھے ہوں وہی زندگی کی مستی بھری شراب سے سرشار ہو کر "ھل من مزید" کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ لیکن ایسا انسان جس نے بستر سے اُٹھ کر اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر "مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کی ضیا" کا نظارہ ہی نہیں کرتا ہے۔ ایسے ہی انسان کو خواب خرگوش سے جگانا مشکل ہوتا ہے۔

اب میں پھر اپنے ان قارئین سے مخاطب ہوتا ہوں جو اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ چلیں ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ پیسہ کمانے کی دھن میں روزمرہ کے بعض بندھے ٹکے معمولات اور بعض معاشی پابندیوں کے باعث آنے والے صفحات میں سے بعض تجاویز واقعی ایسی ہوں گی جن پر خواہش اور سعی کے باوجود بھی آپ لوگ عمل پیرا نہ ہو سکیں گے۔ لیکن پھر بھی بعض تجاویز ایسی ہیں جن سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کے لیے ان شبینہ اوقات کو جو دفتر سے گھر جاتے وقت خرچ ہوتے ہیں اپنے لیے افادہ بخش "سنہری گھڑیوں" میں منتقل کرنا مشکل ہوگا۔ لیکن صبح گھر سے دفتر جانے کے لیے جو تجویز پیش کی گئی ہے۔ وہ دوسروں کی طرح آپ کے لیے بھی اتنی ہی سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ اس طرح دیگر حضرات کی طرح اتوار کے فارغ اوقات کا وقفہ آپ کے لیے بھی ایک دولت ہے البتہ اس کا امکان ہے کہ پورا ہفتہ محنت کرنے کی وجہ سے اعصاب پر جو بوجھ پڑتا ہے اس کی بنا پر آپ اس وقفہ سے پوری طرح متمتع نہ ہو سکیں اس پر مستزاد

ہفتہ کی تین یا زیادہ شاموں کا اہم حصہ رہ جاتا ہے۔ یہ وہ شامیں ہیں جن میں آپ تھکن سے اس قدر چور اور نڈھال ہوتے ہیں کہ کچھ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن میں اس تھکن والی دلیل کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے لیے میرا سیدھا سادا جواب یہ ہوگا کہ اگر آپ کا کام اس قدر تھکان وہ ثابت ہوتا ہے کہ شام ہونے تک آپ کا جوڑ جوڑ ڈھیلا ہو جاتا ہے اور بند بند دُکھنے لگتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کی زندگی کے دیگر اوقات کے ساتھ کام کا تناسب غلط ہے۔ اس لیے اس غیر متوازن زندگی کو نقطۂ اعتدال پر لانے کی ضرورت ہے۔ روزمرہ کے کاموں سے ایک انسان کے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہونے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سے بچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

—— آئیے میں آپ کو ایک تدبیر بتاؤں

وہ کام جو آپ کو روزمرہ کے لائحۂ عمل کے بعد سرانجام دینا تھا اسے آپ لائحۂ عمل کے آغاز سے قبل کریں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اُس کے ساتھ ساتھ ہی کریں —— لیکن اسے آخر میں کسی صورت سے نہ کرنا چاہیے۔ اِس مقصد کے لیے اپنے معمول سے ذرا قبل جاگنا ہوگا۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ خلافِ معمول زیادہ جلد جاگنے کے لیے زیادہ جلدی سونا ہوگا لیکن ایسا کرنا گھر کے تمام نظام کو چوپٹ کرنے کے مترادف ہوگا —— اِس لیے یہ ناممکن ہے! لیکن میرے خیال میں یہ ناممکنات میں سے نہیں ہے اور اگر آپ کوشش کریں تو رات کو جلد سو سکتے ہیں۔ میرا

خیال ہے اگر آپ یہ تہیّہ کر لیں کہ صبح جلد اُٹھنا ہے — آپ اس عہد پہ کاربند بھی رہیں اور مستقل طور سے (الارم لگا کر ہی) صبح جلد اٹھتے رہیں اور پھر اس کے نتیجہ کے طور پر کم خوابی کے باعث اگر آپ کچھ گرانی یا بوجھ محسوس کریں گے تو اس سے چھٹکارا پانے کے لیے آپ خود ہی رات کو جلد سونے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیں گے۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ آپ کم خوابی کی بنا پہ علی الصبح نہ جاگیں گے۔ اِس ضمن میں میرا یہ نظریہ ہے اور ہر سال کے تجربات و مشاہدات سے میرا یہ عقیدہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ نیند کی طوالت کا انحصار — ایک حد تک عادت اور سہل انگاری پر ہوتا ہے۔ میں اب اس امر کا قائل ہو چکا ہوں کہ بعض لوگوں کے لیے گھنٹوں بلکہ پہروں سوتے رہنے کی یہ وجہ نہیں کہ ان کی جسمانی صحت، ذہنی توازن اور قویٰ کی آسودگی کے لیے یوں گھوڑے بیچ کر سونا ناگزیر ہوتا ہے بلکہ اس کا باعث یہ ہے کہ ان کے پاس "فالتو" وقت ہوتا ہے۔ انھیں یہ سلیقہ نہیں آتا کہ فرصت کی ان گھڑیوں کو کیسے اپنے لیے منافع بخش بنایا جائے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ اگر "فرصت کے رات دن" سے وہ خود کو بہلانے کے لیے کوئی مشغلہ تلاش نہیں کر سکتے تو کم از کم "تصورِ جاناں" ہی میں اسے گزار دیں — اور اس لیے وہ بستر پہ اینڈتے رہتے ہیں۔ آپ کے خیال میں وہ گوالا کتنا سوتا ہوگا۔ جو صبح سویرے دودھ کے برتن کے لیے آپ کی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے یا وہ انسان جو منہ اندھیرے مُرغوں کی بانگ سے بھی پہلے ہل کندھے پر دھرے کھیتوں کا رُخ کرتا ہے۔ اِس مسئلہ پر میں نے ایک ڈاکٹر سے تبادلہ خیالات کیا۔ یہ ڈاکٹر پچیس سالوں سے

لندن کے مضافات میں بہت ہی کامیاب پریکٹس کر رہا ہے اور اس کے مریضوں میں مجھ اور آپ ایسے لوگوں کی اکثریت ہے۔ مزاج کے لحاظ سے وہ بہت کڑوا آدمی ہے اور میرے سوال کے جواب میں اس نے مجھے ایسا ہی ترش جواب دیا۔

"زیادہ سونے والوں کی اکثریت احمقوں پر مشتمل ہے"

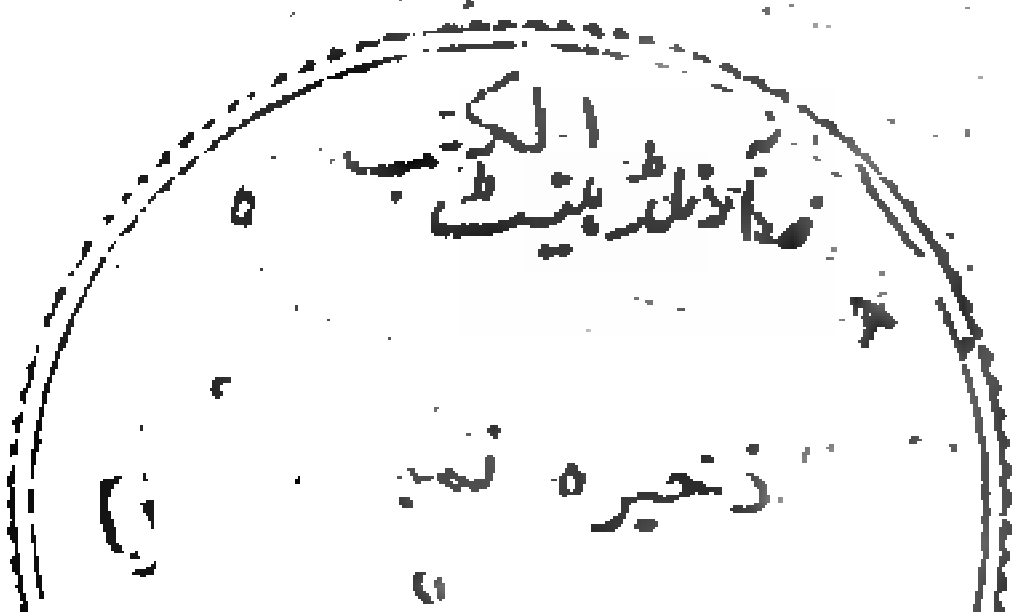
اس نے اپنے جواب کی تفصیلات بتاتے ہوئے مجھے بتایا کہ اگر زیادہ سونے کی عادت کو ترک کر دیا جائے تو دس میں سے نو افراد زیادہ صحت مند پُر نفس، خوش گوار اور ہنستی مسکراتی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

دیگر معالجین نے بھی اس امر کی توثیق کی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ان نوجوانوں پر منطبق نہیں ہوتا جو ابھی عنفوان شباب کے مراحل طے کر رہے ہوں۔

ایک گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ بلکہ اگر ہو سکے تو دو گھنٹے پہلے جاگیے اور رات کو جتنی جلد ہو سکے سو جانے کی کوشش کریں۔ اگر آپ زیادتی کا رستہ لے رہے ہیں تو ایسی صورت میں آپ خود ہی یہ محسوس کریں گے کہ وہ کام جو شام کو دو گھنٹے لیتا صبح ایک گھنٹہ میں ہی تکمیل پا جاتا ہے۔ اب آپ یہ اعتراض کریں گے۔

"میں صبح بغیر کچھ کھائے پیئے کام نہیں کر سکتا اور اس مقصد کے لیے ایک ملازم کی ضرورت ہے جو صبح مجھ سے پہلے اٹھ کر میرے لیے ہلکا پھلکا سا ناشتہ تیار کر سکے" لیکن آج کے دور میں جبکہ سپرٹ لیمپ اور سٹوو ستے داموں مل جاتے ہیں تو آپ کو اپنی بہبود کا انحصار ایک فرد پر رکھنے کی کیا ضرورت ہے جو آج ٹھیک ہے تو کل کو بگڑ بیٹھا ہے۔ آپ رات کے وقت اس فرد کو

(وہ رشتہ میں جو کچھ بھی لگتا یا لگتی ہو) یہ ہدایات دے سکتے ہیں کہ وہ سوتے وقت آپ کے بستر کے قریب کہیں موزوں مقام پر ایک ٹرے دھر دے۔ اس ٹرے میں دو بسکٹ، ایک کپ اور طشتری، ماچس اور سپرٹ لیمپ رکھ دے۔ سپرٹ لیمپ پر ساس پین اور ساس پین پر اُلٹا ڈھکن۔ ساس پین کے اُلٹے ڈھکن پر چھوٹی چائے دانی دھر دے اور اس میں تھوڑی سی پتی ڈال دے۔ اب، آنکھ کھلنے کے بعد آپ کو صرف ماچس جلانے کی تکلیف گوارا کرنا ہوگی۔ تین منٹوں کے اندر اندر پانی کھولنا شروع کر دے گا۔ اب آپ اس پانی کو چائے دانی میں ڈال دیں جو کہ پہلے سے ہی کچھ گرم ہو چکی ہے۔ اگلے تین منٹوں میں چائے تیار ہو جائے گی ـــ یہ لیجئے! چائے تیار ہو گئی ہے اب آپ گرم گرم چائے پینے کے ساتھ ساتھ ہی کام کا آغاز کر سکتے ہیں۔ ایک احمق اور سست انسان کو یہ جزئیات اور تفصیلات فضول معلوم دیں گی۔ لیکن وہ باشعور انسان جس کے دل میں کام کی لگن کے ساتھ ساتھ وقت کی قیمت کا بھی احساس موجود ہے وہ ان تفصیلات کو کبھی بھی لغو اور فضول نہیں قرار دے سکتا ہے۔ اکثر لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہے مگر یہ ایک حد تک درست ہے کہ اس طرح کے غیر معمولی اوقات میں گرم گرم چائے کا ایک کپ وہ نعمت ہے جو بیشتر انسانوں کی زندگی کے محور ـــ ان کے نظامِ اوقات اور ان کی کارکردگی میں ایک خوش گوار اور صحت مند توازن پیدا کر سکتا ہے۔



ایک بات اور!

آرنلڈ بینٹ کا انگریزی کے صاحب طرز ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی یہ مختصر سی کتاب انگریزی ادب میں ایک خاص مقام اور شہرت رکھتی ہے۔ یورپ و امریکہ میں زندگی آموز اور زندگی آمیز کتابوں کا جو سلسلہ ہے اس کتاب کو ان میں نقطۂ آغاز کی حیثیت حاصل ہے۔ شاید اسی لیے ڈیل کارنیگی نے آرنلڈ بینٹ کو اپنا اُستاد مانا تھا۔

ترجمہ اور وہ بھی کسی مخصوص اسلوب والی کتاب کا ترجمہ آسان نہیں ہوتا اسی لیے پابند اور لفظی ترجمہ کی بجائے آزاد ترجمہ سے کام لیتے ہوئے اُسے پاکستانی ماحول کے مطابق اپنا کر اصل متن میں بعض ضروری تبدیلیاں بھی کی گئیں وہ اس لیے کہ ایسی کتابوں کا آدھا اثر تو محض ماحول اور فضا کی اجنبیت سے بھی ضائع ہو جاتا ہے اور تمام تبصرہ نگاروں نے بھی میرے اندازِ نظر کی توثیق کرتے ہوئے ترجمہ کو سراہا۔

یہ کتاب بہت زیادہ مقبول ہوئی اور قلیل عرصہ میں پہلا ایڈیشن بک گیا۔

علاوہ ازیں ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم پشاور نے اسے پشاور ریجن کے مدارس کے لیے منظور کرکے گویا اس کی افادیت کی توثیق کر دی۔

کتاب کے اختتام پر ایک باب کا اضافہ ناگزیر تھا اور "اختتامیہ" کو بھی بیشتر تبصرہ نگاروں نے سراہا۔ اس ضمن میں صرف محترم سجاد نقوی ایم اے (کامران، سرگودھا) کی رائے ہی کافی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے بقول "کتاب کے خاتمے پر سلیم اختر نے اپنی طرف سے بھی کچھ باتیں کی ہیں۔ انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آرنلڈ بینٹ اور سلیم اختر کا اندازِ فکر ایک سا ہے اور شاید اسی مشترک رشتہ کی وجہ ایک معیاری ترجمہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے"۔

یہ ترجمہ ۱۹۶۱ء میں "صبح کرنا شام کا" کے عنوان سے ایک اور ادارہ نے شائع کیا تھا اب اس کا دوسرا ایڈیشن چودھری بشیر احمد صاحب کی مساعی سے "مکتبہ میری لائبریری" کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں۔ پہلے عنوان سے کتاب کا موضوع غیر واضح رہتا تھا اس لیے اب اصل کے مطابق ہی اس کا عنوان کر دیا گیا ہے۔

سلیم اختر

روزمرہ کا ایک معجزہ

"جی ہاں! وہ اُن لوگوں میں سے ہے جنھیں پیسہ خرچ کرنے کا سلیقہ نہیں آتا ہے۔ اچھا کام۔ مستقل اور معقول آمدنی بلکہ اتنے پیسوں میں تو انسان تمام احتیاجات پوری کرنے کے بعد بھی بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی گزار سکتا ہے۔ گو وہ فضول خرچ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ ہمیشہ مشکلات ہی میں پھنسا رہتا ہے۔ اتنے پیسے ہیں لیکن ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اُس کی جیبوں میں سوراخ ہوں۔ اُدھر پیسے آئے اور اِدھر پیسے گئے۔ اس کا مکان بڑا اچھا ہے اور اس کا آدھا حصہ خالی ہے۔ لیکن کوئی دن ہی جاتا ہے کہ وہ کسی کرایہ دار کے لیے مکانوں کے ایجنٹ سے بات چیت کر بیٹھے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا اس کا حلیہ — گو نئے سوٹ میں ملبوس یہ حضرت چمک رہے ہیں۔ مگر ان کی ٹوپی دیکھی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے دادا مرحوم کے زمانہ کی یاد تازہ کر رہے ہوں۔ یہ آج نہیں بلکہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ کل کو آپ انھیں دیکھیں گے تو نئی ٹائی کے ساتھ۔ انھوں نے

ایک پھٹیچر سی پتلون پہن رکھی ہو گی۔ آپ ان کے گھر مدعو ہوں تو آپ یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ گو کھانے کے برتن تو بے حد خوب صورت ہیں مگر گوشت اچھا نہیں ہے۔ یا چینی وہ آپ کو سب سے قیمتی کافی جس کپ میں پیش کریں گے اس کے کنارے ٹوٹے ہوں گے۔ وہ خود بھی اس صورت حال سے بڑا پریشان ہے اور وہ اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔ لیکن اس کی بڑی سیدھی سی یہ وجہ ہے کہ وہ اپنی تمام کمائی ادھر اُدھر بغیر مقصد کے خرچ کر دیتا ہے۔ اگر میری آمدنی اس سے نصف بھی ہوتی تو میں اسے دکھا دیتا کہ کیسے . . . . ."

یہ اس تنقید کی مثال ہے جو ہم میں سے اکثریت کے متعلق اُس کی عدم موجودگی میں کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی انداز سے کی جاتی ہے۔

اگر دیکھا جائے تو ہم میں سے ہر ایک، اپنے وقت کا بادشاہ ہے۔ کون ہے جو تنخواہ والے دن خود کو کسی بنک کے مالک اور کسی سرمایہ دار سے کم سمجھتا ہو۔ مگر یہ تحیر و انبساط وقتی اور ہنگامی ہوتا ہے۔ ہمارے اخبارات و جرائد میں آئے دن اس مسئلہ پر مضامین چھپتے رہتے ہیں کہ کیسے "اتنی" سی آمدنی پر پرنس علی خان بن کر رہا جا سکتا ہے۔ پھر ان مضامین پر ان کے مراسلاتی کالموں میں بحث چھڑتی ہے۔ جس کی شدت سے ہی لوگوں میں ان مسائل سے دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی زیادہ عرصہ کی بات نہیں جب انگلینڈ کے ایک روزنامہ میں اس مسئلہ پر شدید اور گرما گرم بحث چلتی رہی کہ کیا ایک عورت ۸۵ پونڈ سالانہ کی آمدنی پر گاؤں میں رہتے ہوئے اچھے طریق پر زندگی بسر کر سکتی ہے کہ نہیں؟ حال ہی میں میں نے ایک مضمون دیکھا جس کا عنوان یہ تھا:

"اتنی شلنگ ہفتہ میں کیسے گزارا کیا جائے؟" لیکن میں نے آج تک کوئی ایسا مضمون نہ دیکھا جس کا یہ عنوان ہوتا": روزانہ چوبیس گھنٹے کیسے گزارے جائیں؟ حالانکہ اس کے باوجود بھی لوگ یہ کہتے ہیں، وقت بڑی دولت ہے۔ وقت بڑی نعمت ہے ــ اور گزرا زمانہ لوٹ نہ آئے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میرے خیال میں یہ سب وقت کی اہمیت اور قدر و قیمت کے اظہار کی بجائے اس میں کچھ تقلیل پیدا کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وقت دولت نہیں بلکہ ایک عظیم دولت ہے۔ وقت نعمت نہیں، بلکہ نعمتِ غیر مترقبہ ہے اور رائیگاں کیا ہوا وقت واپس ہی نہیں آتا بلکہ حساس انسان کے لیے اس کی یاد بھی دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ اور پھر بڑی بات تو یہ ہے کہ وقت ہونے کی صورت میں (عموماً) دولت بھی کمائی جا سکتی ہے۔ آپ کے پاس اگر دولت ہے تو آپ بہت کچھ خرید سکتے ہیں۔ بہترین کپڑے، شاندار کار، عالی شان بنگلہ ــــ حتیٰ کہ کسی طرح نازنینہ کا دل بھی جیت سکتے ہیں۔ مگر آپ یہ نہیں کر سکتے۔ خیر میری تو بات ہی چھوڑیئے۔ اِس بلی سے ہی اس کا وقت خرید سکیں جو آتش دان کے پاس ایک شانِ استغنا سے بیٹھی اونگھ رہی ہے۔

فلسفہ دانوں نے کئی مسائل کی مانند مسئلہ زمان و مکان پر بھی غور و فکر کیا ہے اور گو وہ مکان کی تشریح میں تو کامیاب ہو گئے ہیں مگر وہ زماں ــــ زمانہ ــ وقت ــــ اِن کی توضیح نہ کر پائے۔ یہ ہر شے سے وابستہ غیر تشریح شدہ خام مواد ہے اِس کے ساتھ سب کچھ ممکن ہے جبکہ اس کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ ہمیں ہر روز جو وقت مہیا کیا جاتا ہے۔ اگر آپ اس کی نوعیت پر ذرا بھی غور

کریں تو یہ کسی معجزہ سے کم نہیں ہے۔ بلکہ جوں جوں اس پر غور کیا جائے ویسے ہی انسان کی حیرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ صبح دم جیسے ہی آپ نے نیند سے بے دلہ ہو کر انگڑائی لی تو اسی وقت چھپر پھٹ سے آپ کے بٹوے کو نئی اور سنہری اشرفیوں کی مانند چوبیس۲۴ گھنٹوں سے بھر دیا جاتا ہے۔ یہ چوبیس۲۴ گھنٹے آپ کی زندگی سے وابستہ اس کائنات کا ایک حصہ ہوتے ہیں جو ابھی شرمندۂ تخلیق نہیں ہوئی — آپ سمجھ گئے میرا مطلب — ؟ یہ چوبیس۲۴ گھنٹے آنے والے وقت کے ہیں۔ یہ آپ کا مستقبل ہے۔ اور آپ ان کے بلا شرکت غیرے تنہا مالک ہیں۔ یہ آپ کی سب سے قیمتی متاع اور عزیز ترین پونجی ہے۔ یہ وہ جنس ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا بھر کی اجناس سے منفرد اور جداگانہ انداز کی حامل ہے اور اس لیے ایک انفرادی طریقہ سے وہ آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔

کہنے کی خاطر میں یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ یہ وہ متاع ہے۔ جسے نہ تو کوئی آپ سے لے سکتا ہے اور نہ ہی کوئی لٹیرا یا راہزن آپ سے چھین سکتا ہے۔ اسی طرح آپ ہی نہیں بلکہ ہر ذی حیات کو وقت کی دولت میں سے مساوی حصہ ملتا ہے۔

آپ لوگ جمہوریت اور مساوات کے نعرے بلند کرتے ہیں اور ہر انسان ایک مثالی معاشرہ اور "یوٹوپیا" کا خواب دیکھتا ہے۔ مگر وقت کی بادشاہت میں ذہانت اور دولت کا سکہ نہیں چلتا ہے۔ دنیا کے سب سے قابل اور ذہین ترین فرد کو ایک گھنٹہ بھی زیادہ نہ ملے گا۔ اس کے شب و روز بھی چوبیس۲۴ گھنٹوں سے تشکیل پائیں گے۔ پھر کسی قسم کی سزا اور تعزیر کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آپ کو اس متاعِ بے بہا میں حسب منشا وقت ضائع کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن

آپ کی اس فضول خرچی کی بنا پر کبھی بھی اس کی روزانہ رسد میں کمی نہ ہوگی نہ ہی اسے یکسر ختم کیا جائے گا اور کبھی بھی آپ کے کانوں میں کوئی پراسرار آواز یا ہاتفِ غیبی سرگوشی کے سے انداز میں یوں نہ کہے گا :

"یہ شخص اگر کھولا یا نا سمجھ نہیں ۔۔۔ تو احمق تو ضرور ہی ہے ۔
یہ اس قابل نہیں کہ اسے وقت کی روزانہ رسد بہم پہنچائی جائے ۔
اس لیے اس کی ترسیلِ اوقات منقطع کر دینی چاہیئے "۔

یہ کتنی یقینی بات ہے کہ آپ اس امر کی طرف سے بالکل بے فکر اور مطمئن ہیں کہ اتوار یا تعطیلات کو بھی اس کی بہم رسانی جاری رہے گی۔ یہ آپ کے بینک اکاؤنٹ کی مانند نہیں ہے کہ آپ نے چیک پر دستخط کئے اور جتنا دل چاہا اتنی ہی رقم نکلوا لی۔ اسی طرح اس پر آپ قرض بھی نہیں لے سکتے ہیں۔ آپ کا اختیار صرف "آج" کے چوبیس گھنٹوں پر ہے۔ آج کی ہر گھڑی، ہر لمحہ اور ہر پل آپ کی غلامی میں دست بستہ کھڑے ہیں۔ آپ چاہیں تو چراغ الہ دین کے دیو کی مانند ان سے عظیم الشان کام لیں اور چاہیں تو انھیں ضائع کر دیں ۔ تساہل کی بنا پر انھیں گنوا دیں۔ یا پھر ان کے وجود سے بے خبری برت کر انھیں اپنی موت مر جانے دیں۔ آپ "آج" کو تو ضائع کر سکتے ہیں، لیکن آنے والا "کل" آپ کے اختیار سے باہر ہے۔ کارکنانِ قضا و قدر نے اسے آپ ہی کے لیے محفوظ رکھا ہے مگر آپ اسے آج نہیں ضائع کر سکتے۔ آپ آج کے چوبیس گھنٹوں پر سے چھلانگ لگا کر آنے والے دن کے ایک گھنٹہ تک دستِ طمع دراز نہیں کر سکتے۔ ویسے اسے بھی آپ ہی کے لیے سنبھال کر رکھا گیا ہے۔

میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ ایک معجزہ ہے ۔ کیا یہ ایسا نہیں ؟
آپ نے اپنی تمام زندگی ان چوبیس گھنٹوں پر بسر کرنی ہے ۔ اور آپ نے ان ہی چوبیس گھنٹوں (بلکہ دن اور رات کے ۱۲ سفید اور ۱۲ سیاہ گھنٹوں) کے تانے بانے سے صحت، مسرت، دولت، طمانیت اور عزت کے مرقعے تیار کرنے ہیں ۔ اسی سے ہی آپ نے اپنی غیر فانی روح کو روحانی سربلندیوں کے ارتقائی مراحل طے کرانے ہیں ۔ اس لیے اس کا صحیح استعمال بلکہ اثر انگیز اور نتیجہ بخش استعمال سب سے زیادہ وقعت اور شدید بلکہ سنسنی خیز اہمیت کا حامل ہے ۔ کیونکہ بالآخر سب کا انحصار اسی پر ہے ۔ آپ کی مسرت ۔۔ وہ سیماب یا حسینہ جسے حاصل کرنے کے لیے آپ لوگ ماند بھی دیوانہ وار بھاگے جا رہے ہیں ۔ اس کا بھی انحصار اسی پر ہے ۔ مجھے تو اسی پر تعجب ہے کہ اخبارات اور روزنامے جو ہر معاملہ میں بے حد باقاعدہ اور باضابطہ رہتے ہیں سال میں بھی تھوڑے پیسوں پر زندگی گزارنے کے "گر" تو بتائے جاتے ہیں ۔ مگر وہ کبھی یہ نہیں بتاتے کہ وقت کی بخشیدہ دولت پر کیسے بسر اوقات کی جائے ۔ وقت کے مقابلے میں دولت تو بہت ہی سستی اور عامیانہ شے ہے ۔ اگر آپ ذرا بھی غور کریں تو فوراً ہی یہ واضح ہو جائے گا کہ دولت بھی دنیا کی عام ترین اشیاء میں سے ایک ہے اور اس کے بڑے بڑے انبار دنیا پر ایک بوجھ کی مانند ہیں ۔
اگر ایک انسان اپنی آمدنی کو روزانہ گزر اوقات کے لیے ناکافی تصور کرتا ہے تو وہ اس کے مزید حصول کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے ۔ وہ چوری کرتا ہے ۔۔ یا پھر وہ اس کے لیے اشتہار دلوا دیتا ہے ۔ اگر ایک آدمی سمجھتا ہے

کہ ایک ہزار پونڈ سالانہ کی آمدنی اس کی احتیاجات کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی تو ضروری نہیں کہ وہ اس کی خاطر اپنی زندگی خراب کرے۔ بلکہ وہ اپنے میزانیہ کو متوازن کرنے کے لیے کمر ہمت کس کر اور دن رات لگا کر محنت کرتا ہے اور یوں پونڈوں کو گنیوں میں تبدیل کر لیتا ہے۔ تانبہ کے سکے چاندی میں اور چاندی کے سونے کے سکوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایک آدمی ایسا لائحہ عمل مُرتب کرنے میں ناکام رہتا ہے جس کی رُو سے چوبیس[24] گھنٹوں کی روزانہ آمدنی اس کے "اخراجات" کی کفیل نہیں ہو سکتی تو وہ ایک اور بھی انداز سے اپنی زندگی خراب کر لیتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت کی رسد اسی فیاضانہ اور شاندار طریقہ سے جاری رہے گی۔ لیکن پھر بھی اس پر ظالمانہ پابندیاں عاید ہو جاتی ہیں۔

ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں اپنے دن کے چوبیس گھنٹوں میں زندہ رہنے اور اپنی زندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ جب میں "زندہ" کہتا ہوں تو میرا مطلب دنیا میں ان کی موجودگی سے نہیں ہوتا۔ نہ ہی مجھے طوعاً کرہاً جینے کے انداز سے دلچسپی ہے۔ اور کتنے افراد اس تکلیف دہ احساس سے آزاد ہیں جو اس خیال سے جنم لیتا ہے کہ ہماری روزمرہ کی زندگیوں میں "خرچ کرنے والے عظیم شعبوں" کی کارکردگی کا طریقہ حسب منشا اور خاطر خواہ نہیں ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگوں کو اس امر کا احساس ہے کہ خوب صورت سوٹ کے ساتھ ان کے سر پر جو ٹوپی ہے وہ کسی کو بھی محفل میں شرمندہ کرا دینے کے لیے کافی ہے۔ یا اپنے کمرۂ طعام کے لیے اچھے سے اچھے اور قیمتی سے قیمتی برتن اکٹھے کرتے وقت کتنے حضرات ایسے ہوں گے جو ان قیمتی برتنوں میں ڈالے جانے والے کھانے کے معیار کی

طرف بھی دھیان دیتے ہوں گے۔ ہم میں سے کتنے اصحاب ایسے ہیں جنہوں نے تمام عمر میں کبھی بھی یہ نہیں کہا۔ "مجھے جب بھی ذرا سا وقت ملا تو میں اسے تبدیل کر دوں گا"

لیکن میری بات مانئے۔ ہمیں کبھی بھی "ذرا سا وقت" نہ ملے گا۔ کیونکہ جتنا بھی وقت ہے وہ ہمارے قبضہ میں رہا تھا اور اب بھی ہے۔ یہ اسی عظیم اور گمبھیر فراموش شدہ حقیقت کا احساس ہے (اور اسے دریافت کرنے والا میں واحد اور اولیں انسان نہیں ہوں) جس کی بنا پر میں نے روزانہ وقت کے اخراجات کے عملی امتحان کا بیڑا اٹھایا۔

خوب سے ہے خوب تر کہاں؟

ہوسکتا ہے کہ آپ ہی میں سے کوئی صاحب اپنی سامع نواز آواز اور مترنم لہجہ میں یوں گویا ہوں۔ "وہ اپنے دن کے چوبیس گھنٹوں سے کیا حاصل کر رہا ہے؟ مجھے تو اپنے چوبیس گھنٹوں کو گزارنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ میں اپنے تمام ضروری ضروری کام کرنے کے بعد بھی معمہ حل کرنے کے لیے وقت نکال لیتا ہوں۔ میں جب چاہوں سینما دیکھ سکتا ہوں اور آئے گئے مہمان یا احباب کے ساتھ ریسٹوران یا کافی ہاؤس میں جا کر خوش گپیوں میں وقت بھی گزار لیتا ہوں۔ یہ تو بالکل سیدھا سادا سا مسئلہ ہے۔ اس میں نہ کوئی پیچیدگی ہے اور نہ کوئی الجھن بھئی! جب ہمیں یہ علم ہے کہ ہمارے پاس صرف چوبیس گھنٹے ہیں تو سارا معاملہ ہی ختم ہو جاتا ہے اور ہم یوں مطمئن ہو جاتے ہیں کہ جب ان چوبیس گھنٹوں میں کمی و بیشی ہوتی نہیں تو پھر ہمیں اس بارہ میں تردد اور فکر یا تشویش کی کیا حاجت ہے۔"

لیکن آپ غلطی پر ہیں۔ جناب! میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ یہ

کہتا ہوں کہ آپ نے نہ تو اس مسئلہ کو سمجھا اور نہ ہی کبھی چوبیس گھنٹے زندہ رہنے کے مسئلہ پہ غور کیا ہے خواہ آپ بُرا ہی کیوں نہ مانیں۔ مگر میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا کہ آپ نے ان حقائق کو سمجھنے میں غلطی کی ہے ـــ وہ آپ ہی تو ہیں جن سے ملنے کے لیے میں ایک طویل مدت سے بے تاب ہوں۔ کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کر لیں گے کہ مجھے اپنے نام، پتہ اور دیگر کوائف سے مطلع کر دیں۔ بلکہ بہتر تو یہ ہو گا کہ آپ چوبیس گھنٹے زندہ رہنے کے بارہ میں اپنا مرتب کردہ لائحہ عمل بتانے کے لیے ضروری معاوضہ بھی بتا دیں۔ بلکہ اب تو صورتِ حال ہی بدل جائے گی بجائے اس کے کہ میں آپ کو کچھ سمجھاؤں اور سکھاؤں۔ میں آپ کے نظریات اور زندگی گزارنے کے انداز سے کچھ اخذ کروں گا۔ آپ مہربانی کریں اور مجھے اس ضمن میں ضروری معلومات بہم پہنچا کر ممنون کریں۔ مجھے یہ تو علم ہے کہ آپ موجود ہیں اور مجھے اس کا یقین ہے کہ آپ زندگی گزار رہے ہیں اور اب تک آپ سے جو شرفِ ملاقات حاصل نہ ہو سکا تو میں اسے اپنی بدقسمتی ہی پہ محمول کر سکتا ہوں۔

جب تک آپ سے سلسلہ جنبانی کا آغاز نہیں ہوتا اس وقت تک میں اپنے ان دوستوں سے باتیں کرتا ہوں یہ وہ لوگ ہیں جو خود کو زمانہ کی مٹھی میں ریت کی مانند محسوس کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں آرزوؤں کے دیپ جلنے سے پیشتر ہی زمانہ کے سرد سانس سے بجھ جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ارمانوں کے تاج محل تعمیر کرنے کے خواہاں تھے مگر جدیدیت کے شکستہ کھنڈروں کی مانند ان پہ ماتم کناں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پہ وقت "راکب" ہے یہ وہ لوگ ہیں جنھیں احساس ہے کہ وقت کا پرندا تیزی سے پر پھڑپھڑاتا گزر رہا ہے۔ مگر یہ

لاچار و مجبور اور بے بس ہیں۔ یہ کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر کر نہیں پاتے ـــ یہ کتاب زیست کے منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کرنے کی سعیٔ لاحاصل کرتے ہیں۔ مگر انھیں اس کا سلیقہ نہیں آتا اور اس لیے یہ مایوس ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم اس احساس کا تجزیہ کریں تو اساسی لحاظ سے یہ بے چینی اور بے کلی کی سی کیفیت سے عبارت ہے۔ مگر بے چینی اور بے کلی کی یہ کیفیت تنہا نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فرد کے دل میں کچھ خوش آئند توقعات، آنے والے حالات سے خوش گوار امکانات، تمنائیں اور آرزوئیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ سب مل جل کر ایک طرح سے بھنور کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور فرد کا دل و دماغ ان ہی میں الجھا رہتا ہے۔ اسی لیے وہ مستقل طور سے بے چین اور غیر مطمئن رہتا ہے اور خوشی کے موقعے پر جبکہ وہ نشاط کی کلیاں چننے میں مشغول ہوتا ہے تو یہ توقعات و امکانات اور آرزوئیں اس کے مسرت زا اور کیف آگیں احساسات پہ ایک "آسیب" کی مانند سایہ فگن ہو جاتی ہیں۔ اس "آسیب" کی آمد کے لیے کوئی موقع اور محل مخصوص نہیں ہے۔ آپ مزاحیہ فلم دیکھ رہے ہیں اور ہنستے ہنستے آپ کے پیٹ میں بل پڑ گئے ہیں۔ انٹرول میں آپ سگرٹ کا کش لگا کر خود کو بڑا ہلکا پھلکا مطمئن اور مسرور محسوس کرتے ہیں اور ایسے ہی لمحے اس کی سرد انگلیاں جیسے آپ کے دل پہ ہاتھ رکھ دیتی ہیں ـــ کیا واقعی میں مطمئن اور خوش ہوں؟ آپ سوچتے ہیں ـــ سوچتے ہیں اور سوچتے ہی رہ جاتے ہیں۔ آپ نے آخری بس پکڑنی ہے اور آپ یہ جانتے ہیں کہ اگر سینما شو والی یہ بس نکل گئی تو سمن آباد پیدل جانا ہوگا اس لیے آپ لمبے لمبے ڈگ بھرتے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ آپ بس شاپ پر قبل از وقت

آپہنچے میں مگر آپ کی بوڑھی ہڈیاں دکھ رہی ہیں ـــــ سانس تیزی سے چل رہی ہے۔ اور سرما کی تیز ہوا کے باوجود بھی آپ کے ماتھے پر پسینہ کے قطرے چمک رہے ہیں، آپ بے کیفی سے سامنے ویران سڑک پر نگاہ دوڑاتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی کار تیزی سے گزر جاتی ہے اور اس کی پچھلی سرخ روشنی نیم تاریک سڑک پر بتدریج معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ اتنے میں وہی آسیب آجاتا ہے، آنکھوں کی جگہ دو گڑھے، منہ کھلا ہوا، جیسے وہ آپ کی حالت پر قہقہہ زن ہو اور کھڑکھڑاتی ہڈیوں سے جیسے سوال کیا جاتا ہے! "اے شخص! تو نے اپنے شباب کے عطر بیز پھول کا کیا کیا؟ تم شباب کی مسحورکن مُشک سے کیا کرتے رہے ہو؟"

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ توقعات اور مستقبل کے سُہانے سپنے تو ہماری زندگی کا ایک جزو لاینفک ہیں انسانی زیست ان ہی سے عبارت اور انسانی ارتقا ان ہی سے ملزوم ہے ـــ بالکل بجا فرمایا!

لیکن آپ یہ تو بھول ہی گئے کہ ہر چیز کی طرح خواہشات کے بھی مدارج اور درجات ہوتے ہیں۔ آپ کی خواہش حج جا کر روضۂ اقدس کی جالیوں کو بوسہ دینے کی ہے۔ مذہبی احکامات سے قطع نظر بھی آپ کے دل کی یہی پکار ہے کہ گنبدِ خضرا کے مکیں کے حضور اپنے گناہوں کو اشکِ ندامت سے دھویا جائے۔

اب ظاہر ہے کہ اس کے لیے جہاز اور دیگر لوازمات کی موجودگی اور ان کے حاصل کرنے کے لیے پیسہ کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر آپ جوشِ عقیدت میں پیدل ہی چل دیں تو آپ کا وہاں پہنچنا ناممکن اور محال ہے یا تو آپ بحیرۂ عرب کی تہ میں مچھلیوں کے لیے عشائیہ کی صورت میں پیش ہوں گے اور ایک "دادی" مچھلی

چھوٹی سی مچھلی کو سمجھائے گی " دیکھو بیٹا! یہ انسان ایسا ہوتا ہے - یا پھر آپ کسی سڑک یا صحرا میں آیلر یا پرٹ سے دم توڑ رہے ہوں گے - اور یہ ناتکمیل شدہ تمنا سدا کے لیے آپ کو تڑپاتی رہے گی - ہو سکتا ہے آپ کے پڑوسی کی بھی یہی خواہش ہو - مگر اس آرزو نے اسے آپ کی طرح " کچھ " کرنے پر مجبور نہ کیا اور گو اس کے دل میں بھی یہی خواہش چٹکیاں لیتی رہتی ہے مگر وہ لاہور نہیں چھوڑنا چاہتے

دراصل ــــ اصل بات تو لاہور چھوڑنے میں پوشیدہ ہے - ہم میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو لاہور نہیں چھوڑتے بلکہ جو اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے کہ گھر سے نکل کر کسی سفری ایجنٹ سے اس کے بارہ میں استفسارات ہی کر ڈالیں - اس کے لیے ہمارے پاس سب سے بڑا جواز تنگی وقت کا ہے ہم آہ بھر کر کہتے ہیں اوہ! ان چوبیس گھنٹوں میں کیا کیا کر سکتا ہوں -

اگر اس مبہم سی بے کلی اور اس سے وابستہ خواہشات و مقاصد کا ذرا بھی ژرف نگاہی سے جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خواہشات اور ان کی عدم تسکین کی صورت میں بے کلی کا یہ احساس فرد کے اس نظریہ یا خیال پر استوار ہوتا ہے کہ میں اخلاقاً یا معاشی حالات کی بنا پر جو کچھ کرنے پر مجبور ہوں مجھے اس کے علاوہ بھی مزید کچھ کرنا چاہیے - سماجی ضوابط اخلاقی اقدار اور رضا عاید کردہ حقوق کی رو سے یہ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اپنی اور اپنے کنبہ (اگر موجود ہو) کی صحت اور آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھیں - ہمیں اپنے قرض ادا کرنے چاہئیں - ہمیں پس انداز کرنا چاہیے اور اپنی صلاحیتوں اور استعداد میں اضافہ سے آمدنی بڑھا کر اپنی خوشحالی میں اضافہ کریں ــــ اور یہ کام ہے نے شہر لانے

کے مترادف ہے۔ ہم میں سے بہت کم اصحاب یہ کارگزاری کر کے دکھا سکتے ہیں
کیونکہ اکثر حالات میں تو ہم اپنے معاشی مسائل اور ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اس کی
بجا آوری کے اہل ہی نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ہم راہ کی مشکلات پر قابو پا کر ــــ
اور نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس میں کامیاب ہو بھی جاتے ہیں۔ تو
پھر بھی ہم اس سے مطمئن نہیں ہوتے ہیں۔ وہ آسیب مسلسل ہمارے ساتھ رہتا ہے۔
یوں خوب سے خوب تر کی جستجو ہم کو سیمابیت عطا کر کے ہماری نظر کہیں بھی
نہیں ٹھہرنے دیتی اور نتیجتاً ہم بلند سے بلند تر کی طرف پرواز کناں رہتے ہیں۔
بعض اوقات ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔
ہمارے وسائل اور قوئے اس کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ محسوس
کرتے ہیں کہ اگر ہم نے تاش کے پتوں کی مانند بکھری ہوئی مصروفیات میں سے کچھ
وقت اور نکال لیا تو ہم نسبتاً زیادہ خوش اور مطمئن رہیں گے۔

ــــ اور جذبہ کی یہی وہ قندیل ہے جو دل میں فروزاں ہونے کی صورت میں
نامور حضرات کو جنم دیتی ہے۔ تاریخ ایسے لوگوں کے کارناموں سے بھری پڑی
ہے۔ جنھوں نے اپنی زندگیوں کی مخصوص نہج اور عام ڈگر سے ہٹ کر سوچا ــــ
سعی کی اور کامیابی کی صورت میں نام پیدا کیا۔ یہ جذبہ صرف بڑے لوگوں کے لیے
ہی مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ سبھی اس سے آشنا ہوتے ہیں۔ صرف اس کی شدت اور
اس کے تحت جدوجہد کے طریقہ سے فرق پڑتا ہے۔

اگر آپ کے خیالوں پر کسی نصب العین کا راج ہے اگر آپ کے دل میں
آرزو کے دیپ کی جوت موجود ہے تو جب تک آپ اپنے مقصد کو پا نہیں لیتے

سعی کناں نہیں ہوتے اس وقت تک آپ کے ذہن میں "کچھ وقوع پذیر ہونے کے امکانات" چیونٹیوں کی مانند رینگتے رہیں گے۔ وقت پر نہ وقت آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ کچھ ہونے والا ہے مگر جب کچھ بھی نہ ہوگا تو آپ بے کیفی اور بے چینی سی محسوس کریں گے۔ اس احساس یک خلفشار کو کئی نام دیئے جا چکے ہیں۔ طلب علم اسی کے باعث ہے۔ یہ جذبہ اتنا قوی اور شدید ہوتا ہے کہ باضابطہ حصول علم کے باوجود بھی انسان خود کو اتنا "عالم" یا "علامہ" نہیں سمجھتا کہ وہ مزید معلومات حاصل کرنے سے خود کو قاصر پاتا ہو۔ نیوٹن نے کہا تھا میں خود کو اس بچہ کی مانند محسوس کرتا ہوں جو بحرِ علم کے ساحل پر کھڑا سیپیاں چن رہا ہو۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ہربرٹ سپلنسر بھی — جو میرے خیال کے مطابق دنیا کے ارفع اور عظیم ترین ذہن کا حامل تھا — کسی مسئلہ کے سلسلہ میں عالم کی مسند سے اتر کر طالب علم کے درجہ پر آجاتا تھا۔

میرے خیال میں اپنی زندگی کو زندہ رہ کر گزارنے کے خواہاں اصحاب — یہاں ذہنی تجسس کے حامل افراد سے مراد ہے — جب اپنی زندگیوں کے عام اور مروجہ انداز سے ماورا ہو کر کچھ کر دکھانا چاہتے ہوں تو عموماً وہ ادبی کاوشوں کا سہارا لیتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ مطالعہ شروع کرتے ہیں اور بے تحاشا کتابیں پڑھتے ہیں۔ بلاشبہ اب پاکستانی حضرات ادب پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں اور اگر قلم کار بن کر نہیں تو ذہنی لحاظ سے تو وہ ضرور ہی ادیب بن رہے ہیں۔ مگر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ زندگی صرف ادب سے عبارت نہیں ہے اور نہ ہی تمام علم صرف ادب سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ چند کلیوں پر قناعت

کرنے والے "نادانوں" سے میں یہ عرض کروں گا کہ باغِ ہستی اور گلستانِ زیست گلہائے رنگارنگ سے معمور ہے۔ اِس لیے بہبودیٔ ذات اور حصولِ علم کے لیے ادب کے علاوہ اور بھی کئی چشمے ہیں جہاں سے تشنگی بجھائی جا سکتی ہے۔ وہ چشمے کون کون سے ہیں اور ان سے کیسے کیسے پیاس بجھائی جا سکتی ہے۔ اس پر میں بعد میں روشنی ڈالوں گا۔ البتہ ادب کے لیے موزوں ذہن اور طبیعت نہ رکھتے ہوئے اس کے ساتھ دن رات بے ادبی کرنے والوں سے میں یہ ضرور کہوں گا کہ زندگی کے دامن میں آپ کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ آپ کیوں ایک ہی پھول کو مسلے جا رہے ہیں۔

بس چھلانگ لگا دو

اب جبکہ میں آپ کو یہ احساس کرانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ (اگر واقعی ایسا ہوا ہے) کہ آپ اپنی روزانہ زندگی اور اس سے وابستہ روزمرہ کے لائحہ عمل کی بنا پر ناکام آرزوؤں اور برباد تمناؤں کے ہاتھوں مستقل طور سے ایک عجیب قسم کے ذہنی خلفشار میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس بے اطمینانی اور پریشانی کی اساس اس احساس پر استوار ہے کہ ہر شب جب آپ بستر پہ دراز ہوتے ہیں تو کچھ کرنے کی خواہش ذہن میں سر اٹھا لیتی ہے۔ آپ اسے کرنا بھی چاہتے ہیں لیکن آپ اس وقت کے منتظر ہیں جب آپ کے پاس کچھ "فالتو وقت" ہو لیکن میں تو ابتدا ہی میں روز روشن ایسی عیاں حقیقت آپ پہ واضح کر چکا ہوں کہ آپ کے پاس کبھی بھی "فالتو وقت" نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ کا کل وقت تو آپ کے پاس ہے صبح اٹھتے ہی آپ کو چوبیس گھنٹے دے دیئے گئے تھے اب نہ ان میں سے کچھ واپس لیا جائے گا اور نہ ہی آپ کو "فالتو وقت" دیا جائے گا۔

لیکن اگر آپ اس توقع پر بیٹھے ہیں کہ میں آپ کو کوئی ایسا چھو منتر بتاؤں گا جس سے آپ اپنے لیے ایک مثالی لائحہ عمل مرتب کرنے کے بعد اس پریشان کن دائمی اور تکلیف دہ احساس سے مستقل طور پر چھٹکارا حاصل کر لیں گے جو ناکامیوں کی تلخی کا جنم دہندہ ہوتا ہے تو صاحب! اپنے دل سے یہ خیال نکال دیں کیونکہ میرے پاس کوئی ایسا جادو نہیں ہے نہ ہی مجھے اس کے ملنے کی توقع ہے اور نہ ہی میرے خیال میں کوئی اور اسے پا سکتا ہے۔ یہ غیر دریافت شدہ ہے۔

ہو سکتا ہے اس کتاب کو کھولتے وقت آپ کے دل میں کسی امید پر مردہ آرزوئیں زندہ ہو گئی ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ نے یہ سوچا ہو

"یہ شخص مجھے ایسی ترکیب بتا دے گا جس کے ذریعے سے
میں وہ سب کچھ کرنے کے قابل ہو جاؤں گا جس کے میں
آج تک خواب دیکھتا رہا ہوں۔ یہ شخص مجھے کوئی ایسا
آسان سا گر بتا دے گا جسے اپنا کر میں مراحل کامرانی صعوبتوں
اور مصائب سے دوچار ہوئے بغیر ہی طے کر لوں گا"

مگر افسوس! صد افسوس!! حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی راستہ اتنا سیدھا نہیں جو آپ کا بی او مقصود سے وصل کرا دے۔ چشمۂ حیات تک جانے کا راستہ صدہا پرخطر مراحل اور ہزارہا مصائب سے پُر ہے۔ اور پھر سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ اتنی صعوبتوں اور محنت و کشاکش کے بعد بھی آپ وہاں نہیں پہنچ سکتے۔

اس ضمن میں ایک ہی حقیقت اساسی اہمیت اور اولیں اور مبادی نوعیت کی حامل ہے۔ اگر آپ چوبیس گھنٹوں کے میزانیہ کو ایک خوشگوار طریقہ سے ترتیب

دینا چاہتے ہوں تو آپ کو اس کام کی مشکل کا احساس کر لینا چاہیئے۔ آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سعیِ مسلسل کا نام ہے اور آپ پر یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ اس کے لیے قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔ میں اس پر زیادہ اصرار نہ کروں گا۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں بھرا بستر ہوتی ہے۔

اگر آپ کو یہ غلط فہمی (یا خوش فہمی) ہو کہ آپ ہاتھ میں قلم لے کر کاغذ کے ٹکڑے پر ایک نظامِ اوقات اور لائحہ عمل مرتب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو آپ فوراً اس کی توقع دل سے نکال دیں۔

لیکن اگر آپ ناکامیوں اور تصورات کی شکست کو گوارا نہیں کر سکتے تو بہتر یہ ہے کہ آپ اس جھنجھٹ ہی میں نہ پڑیں۔ اسی طرح اگر آپ زیادہ سعی اور عظیم کام کے معاوضہ میں تھوڑے نتائج کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس صورت میں بھی آپ یہ راستہ نہ اختیار کریں۔ آپ ساحل پر تکلیف دہ غنودگی کے عالم میں لیٹ جائیں۔ یہی آپ کی زندگی ہوگی۔ کیونکہ آپ اسے ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ جو لوگ طوفانوں سے لڑنا چاہتے ہیں انھیں آپ ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ یہ ایک المناک حقیقت ہے کیا آپ اس سے اپنے ذہن میں پژمردگی اور دل میں غم کی کسک نہیں محسوس کرتے۔ تاہم میرے خیال میں صورتِ حالات اتنی بُری اور پریشان کن نہیں ہے بلکہ اس میں بھی کچھ بہتری پوشیدہ ہے۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو آپ کچھ کارگزاری کرنے کے لیے قوتِ ارادی کو کیسے مضبوط کریں گے۔ میں ذاتی طور سے بھی اِسے پسند کرتا ہوں۔ بلکہ میرے خیال میں تو مجھ میں اور آتشدان کے پاس بیٹھی ہوئی بلی میں فرق ہی صرف یہی ہے۔

آپ کہتے ہیں۔ "چلیے! فرض کر لیں کہ میں آنے والے معرکہ کے لیے کمربستہ ہو چکا ہوں۔ یہ بھی فرض کر لیں کہ میں نے آپ کے بلند پایہ ارشادات پر غور و فکر کر کے اُن کی اہمیت سمجھ لی ہے۔ اب مجھے یہ سمجھائیے کہ میں آغازِ کار کیسے کروں؟"

جنابِ من! اس کے لیے کوئی قلعہ شکن توپوں کی ضرورت نہیں ہے بس آپ آغازِ کار کر دیں ۔۔۔ جی ہاں! بس شروع کر دیجئے! آغازِ کار کے لیے عمر عیّار کی زنبیل یا سلیمانی ٹوپی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تالاب کے کنارہ کھڑا ہوا کوئی انسان آپ سے یہ دریافت کرے کہ میں ٹھنڈے پانی کے اس تالاب میں کیسے چھلانگ لگا دوں؟ تو آپ اسے کیا جواب دیں گے ۔۔۔ یہی نا ۔۔۔ "بس چھلانگ لگا دو ۔۔۔ ذرا دل کو کڑا کر دا اور کود پڑو!!"

جیسے میں گزشتہ اوراق میں بتا آیا ہوں کہ وقت کی دائمی رسد کا سب سے نمایاں اور حسین ترین پہلو یہ ہے کہ آپ اپنے دائمی وقت کو قبل از وقت نہیں خراب کر سکتے ہیں ۔۔۔ اگلا سال ۔۔۔ اگلا مہینہ ۔۔۔ اگلا دن ۔۔۔ اور اگلا گھنٹہ یہ سب آپ ہی کے لیے سنبھال کر ذخیرہ کئے گئے ہیں۔ اور یہ آپ کو ٹکسال سے تازہ ترین ڈھلے ہوئے سکوں کی مانند بالکل صحیح اور مکمل حالات میں ایسے ملیں گے گویا آپ نے تمام عمر میں کبھی ایک لمحہ بھی خراب اور ضائع نہ کیا تھا۔ یہ امر ایسا ہے جس کی بنا پر آپ کو کبھی بھی آس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے اور اسی لیے آپ کو ممنون ہونا چاہیے۔ یہ تو آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے یا آپ چاہیں تو ہر گھڑی کتابِ زیست کا نیا ورق اُلٹ سکتے ہیں۔ اس لیے ایک ہفتہ بعد کے موزوں پل اور

مناسب موقع کا انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے خیال میں آپ زمانہ طالب علمی کے ابتدائی دور میں ہی اس حقیقت سے آشنا کرا دیئے گئے ہوں گے۔

آج کا کام کل پر نہ ڈالو

اگر آج آپ تالاب کے کنارے کھڑے یہ سوچ رہے ہیں کہ ایک ہفتہ بعد پانی گرم ہو گا تو بے فکر رہیں — پانی جب بھی ٹھنڈا ہی ہو گا۔

لیکن بیشتر اس کے کہ آپ کچھ کرنے کا تہیہ کرتے ہوئے آغاز کریں میں آپ کو کچھ ہدایات دینا چاہتا ہوں۔ یہ صرف آپ کی ذات کے لیے ہیں اور ان ابتدائی احتیاطوں کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔

سب سے پہلے تو آپ اپنے ولولہ اور سرگرمی سے ہوشیار رہیں۔ کیونکہ اسے انتہا پر پہنچا دینے سے یہ ایک خطرناک، گمراہ کن اور دھوکا دینے والی چیز ثابت ہوتی ہے۔ یہ وہ دیو ہے جو آپ سے ہمیشہ مزید کام کا طالب ہوتا ہے — اور آپ اس کی تسکین نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ چاہتا ہے کہ پہاڑوں کو ہلا دے، صحرا میں پھول کھلا دے اور دریاؤں کے رُخ بدل دے۔ یہ اس شعلہ کی مانند ہے جو اپنی ہی آگ میں بھسم ہو جاتا ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ جب یہ اپنی پیشانی پر موت کا سرد سانس محسوس کرتا ہے تو اس کی موت اتنی اچانک ہوتی کہ اتنا کہنے کی تکلیف بھی نہیں گوارا کرتا۔ "ہم بس آئے اس دھندے سے!"

اس لیے آپ شروع میں بہت کچھ کرنے کے ارادے نہ باندھیں بس تھوڑے سے پر ہی قناعت کر لیں اور اس میں بھی حادثات، اتفاقات اور اَن دیکھے ہنگامی حالات کے لیے گنجائش رکھ لیں۔ سب سے بڑھ کر انسانی فطرت اور

خصوصیت سے اپنی ذات ـــــ کی بعض کمزوریوں کو ضرور ملحوظ رکھیں۔

ایک ناکامی یا اس سے ملتی جلتی حالت سے ہراساں یا متوحش نہ ہوں۔ اگر اس سے آپ میں بے اعتمادی نہیں پیدا ہوتی یا عزتِ نفس میں کمی نہیں پیدا ہوتی تو ایسی صورت میں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ناکامی کامرانی کا پہلا زینہ ہے اور ایک ناکامی کا یہ مطلب نہیں کہ آپ زندگی میں ہی ناکام ہو گئے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ کر دکھلانے کا جذبہ ہی اکثر لوگوں کی ناکامی یا بربادی کا باعث بنتا ہے۔ جب آپ اپنے محدود چوبیس گھنٹوں میں اطمینان و سکون سے زندہ رہنے کے عظیم منصوبہ کا افتتاح کر رہے ہوں تو آپ کو قریبی مستقبل کی طرف سے بے فکر ہو جانا چاہیئے۔

اکثر لوگوں کے خیال میں ایک معمولی قسم کی کامیابی سے ایک عظیم الشان ناکامی بدرجہا بہتر ہے۔ مگر میں ـــ کم از کم اس ضمن میں ـــــ اس سے متفق نہیں ہوں۔ ایک عظیم الشان ناکامی کی صورت میں آپ کا دامن تہی رہتا ہے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ ایک چھوٹی اور غیر اہم کامیابی کسی ایسی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہو جو چھوٹی اور غیر اہم نہ ہو۔

اس لیے ہمیں آج ہی اپنے روزانہ وقت کے میزانیہ کا جائزہ لینا چاہیئے۔ آپ کو یہ شکایت ہے کہ آپ کا وقت تو مختلف کاموں میں اس قدر بٹ چکا ہے کہ اب وہ اس پیالہ کی مانند ہے جس کا پانی کناروں سے باہر چھلکنے کو ہو۔

ـــــ مگر کیسے ؟

آپ نے روزی کمانے کے لیے کتنا وقت صرف کیا؟ ــــــــ

سات گھنٹے! اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ نے سونے میں کتنا وقت لگایا؟

ــــــــ سات گھنٹے؟ چلیے میں فیاضی سے کام لیتے ہوئے آپ کو خوابِ راحت کے مزے لوٹنے کے لیے دو گھنٹے اور دے دیتا ہوں۔ اب آپ یہ بتائیے کہ آپ نے باقی آٹھ گھنٹوں کو کس کوئیں میں ڈالا؟

ــــــــ

ڈبے میں ڈبیا

اب ہمارے سامنے وقت گزارنے بلکہ وقت خرچ کرنے کا مسئلہ ہے اور اس مسئلہ سے وابستہ تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے میرے خیال میں ایک انفرادی مثال کا تجزیہ بے حد ضروری ہے۔ میں صرف ایک ہی مثال پیش کر سکتا ہوں اور یہ مثال اوسط درجہ کی مثال نہیں سمجھی جا سکتی، کیونکہ جس طرح کوئی آدمی اوسط درجہ کا نہیں ہوتا اسی طرح کوئی مثال اوسط درجہ کی مثال نہیں ہوتی ہے۔ ہر آدمی اپنے مخصوص حالات اور ماحول کی وجہ سے انفرادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح ہر آدمی کی مثال بھی منفرد ہو گی۔

اب اگر بطور مثال میں ایک ایسے آدمی کو لیتا ہوں جو لاہور میں رہتا ہے جو ساڑھے چھ گھنٹے کی ڈیوٹی دیتا ہے اور جو گھر کے دروازے سے نکل کر دفتر میں اپنی کرسی پر بیٹھنے کے لیے اومنی بس والوں کی مہربانی سے کم از کم صبح شام ایک گھنٹہ ضائع کرتا ہے۔ مجھے اس ضمن میں ہر ممکن طریقہ سے حقائق کو ملحوظ رکھنا ہو گا۔

ویسے تو یہاں ایسے افراد بھی ملیں گے جو صبح سے شام بلکہ رات تک کام کرنے کے بعد روزی پیدا کرتے ہیں جبکہ ایسے خوش نصیب بھی موجود ہیں۔ جنہیں بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے من و سلویٰ ملتا رہتا ہے اور پھر بعض ایسے بھی ہیں جو کم وقت میں زیادہ کما لیتے ہیں۔

کتاب کے نفسِ موضوع کے اعتبار سے ہمیں یہاں فرد کی معاشی حالت سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ ہم کیونکہ وقت سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے نوّے روپیہ پانے والے ایک معمولی کلرک سے لے کر ہزار روپیہ پانے والے پاس تک سبھی اس زمرہ میں آجاتے ہیں۔

جہاں تک دن گزارنے کا تعلق ہے اس بارہ میں جو سب سے اہم اور خطرناک غلطی کی جاتی ہے۔ وہ غلطی عمومی رجحان کی بنا پر ہوتی ہے۔ یہ ایسی غلطی کے باعث ہے کہ فرد کی قوت و توانائی اور دلچسپیوں میں دو تہائی کی نسبتاً سے کمزوری اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی مثالوں کی اکثریت ہے جن کی صورت میں وہ اپنے کاروبار یا کام کے لیے کوئی خاص سرگرمی اور جوش نہیں محسوس کرتا آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے کاروبار کو ناپسند نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنے کام کو ـــ حتی الامکان تاخیر کے بعد ایک قسم کی مردہ دلی اور اکتاہٹ سے شروع کرتا ہے اور اپنے مخصوص حالات کے تحت جب اسے جلد از جلد ختم کرتا ہے تو وہ خود کو بے حد مسرور و مطمئن محسوس کرتا ہے۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے دوران اس کے قویٰ کبھی بھی اپنی انتہائی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کرتے ـــ ویسی کارکردگی جسے ہم "فل ہارس پاور"

قرار دے سکیں " (میں جانتا ہوں کہ اسے پڑھ کر اکثر شہری لوگ آگ بگولا ہو جائیں گے۔ لیکن میرے لیے شہر اور اس کے لوگ کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ اس لیے میں نے جو کچھ لکھا ہے میں اس کے ایک حرف سے بھی منحرف ہونے کو تیار نہیں ہوں)۔

لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنے تمام "دن" کو ساڑھے چھ گھنٹوں تک محدود رکھتا ہے۔ اور دفتر سے نکلتے ہوئے وہ آہ بھر کر کہتا ہے۔ "آج کا دن بھی یونہی غارت ہو گیا"۔ لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ دن اور رات چوبیس گھنٹوں سے مل کر بنتے ہیں۔ یہ ساڑھے چھ گھنٹے نکال کر بقیہ ساڑھے سترہ گھنٹے بچتے ہیں وہ بھی اس کے دن ہی کا ایک حصہ تھے مگر اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اپنے دن کو دفتری اوقات کے ساتھ منطبق کر کے وقت کی کمی کا شاکی ہو بیٹھا۔ گو یہ رجحان لاشعوری ہی سہی۔ مگر اس کا اتنا اثر ضرور ہوتا ہے کہ وہ باقی ساڑھے سترہ گھنٹوں کے لیے کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہیں محسوس کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خواہ وہ ان ساڑھے سترہ گھنٹوں کو ضائع نہ بھی کرے پھر بھی وہ انھیں کسی شمار میں نہیں لاتا ——— یہ تو اس کے لیے تصویر کے حاشیہ کے مترادف ہیں۔ گو حاشیہ تصویر کے حسن میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے۔ مگر بہر حال اسے تصویر کا ایک حصہ تو نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔

سوچنے کا یہ عمومی انداز صرف غیر منطقی ہی نہیں بلکہ غیر صحت مندانہ بھی ہے۔ کیونکہ اس انداز فکر اور رجحان طبع کی بنا پر وہ چوبیس گھنٹوں میں سے صرف وقت کے ایک حصہ کو ہی اساسی اہمیت کا حامل تصور کرتا ہے اور لطف تو یہ ہے کہ وقت کے اس حصہ سے وابستہ کارکردگی اور وظائف سے اسے کوئی دلچسپی نہیں

ہوتی بلکہ یہ تو اس کے لیے اچھی خاصی بیگار کے مترادف ہوتا ہے ۔ اس کا آغاز بے کیفی اور بے لطفی سے کرتا ہے اور اس کا اختتام اس کے لیے باعث مسرت ہوتا ہے ۔ آپ خود ہی سوچیئے وہ آدمی جو اپنی زندگی کے دو تہائی حصہ کو ایک تہائی حصہ کا غلام اور تابع فرمان بنا دیتا ہے اور پھر یہ ایک تہائی بھی وہ ہے جس کے لیے وہ سرگرم جذبات نہیں رکھتا تو بھلا کیسے وہ اپنی زندگی کی تکمیل کرتے ہوئے جینے کا حق ادا کر سکتا ہے ـــــ اس کے لیے ایسا کرنا ناممکن ہے!

مکمل طور سے اپنی زندگی گزارنے کے متمنی آدمی کو سب سے پہلے چوبیس[۲۴] گھنٹوں کے ایک دن میں سے اپنے لیے ایک جداگانہ "دن" کی تشکیل کرنی ہوگی ۔ یہ دن ایسا ہے جیسے ایک بڑے ڈبے میں ایک چھوٹی ڈبیا رکھی ہو ۔ یہ دن طلوع آفتاب سے نہیں شروع ہوگا بلکہ اس کا آغاز غروب آفتاب سے ہوگا ، اور ساڑھے سترہ گھنٹے کے اس دن میں اس نے کسی دفتر کو نہیں جانا بلکہ اس نے اپنی جسمانی ضروریات کی تسکین کے ساتھ ساتھ روحانی سرخوشی اور اپنے بھائی بندوں کی بہبود کے لیے کوشاں ہونا ہے ـــــ وہ اس تمام وقت میں آزاد ہے ۔ اور اپنا آقا خود ہے ۔ کیونکہ اب اس نے روزی نہیں کمانی اس لیے اس کا ذہن معاشی الجھنوں کے گرداب میں نہیں پھنسا ہوتا اس لیے وہ اپنا اور اپنے وقت کا بادشاہ ہے ۔ یہ انداز اور رجحان بے حد ضروری اور اہم ہے ۔ کیونکہ عملی زندگی میں کامیابی کا انحصار اسی پر ہے ۔

ـــ ـــــ اور یہ آپ نے کیا کہا؟ اگر اس وقت یہ ہی اپنی تمام تر توجہ اور قوت صرف کر دی تو اس سے جو اضمحلال پیدا ہوگا اس کے باعث دفتری اور

کاروباری اوقات میں کارکردگی کا اظہار طریق احسن نہ ہوسکے گا۔ لیکن جناب آپ غلطی پر ہیں! بلکہ نتیجہ اس کے برعکس ظاہر ہوگا اور اس سے آپ کے کاروباری اور فرصتی اوقات کی قدر و قیمت بھی بڑھ جائے گی۔ آپ ایک اساسی اہمیت کی بات ذہن نشین کر لیں۔ قوئی ذہنی کی ساخت اس نہج پر ہوئی ہے کہ آپ ایک طویل مدت تک ان سے مسلسل اور سخت قسم کی کارکردگی کرا سکتے ہیں کیونکہ یہ ٹانگوں یا بازوؤں کی مانند جلدی سے نہیں تھک جاتے ہیں۔ انھیں تو ــــ ماسوائے نیند ــــ آرام کی نہیں بلکہ تغیر اور تبدیلی کی حاجت ہوتی ہے۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ ایک عام آدمی کیسے اپنے اوقات سے انصاف کرتا ہے اور وہ اپنے وقت کے خرچ میں کسی حد تک سمجھ بوجھ اور دانشمندی کا ثبوت دیتا ہے۔ ہم اس کی بیداری سے آغاز کرتے ہیں۔ میں صرف وہ افعال و حرکات لوں گا جو وہ کرتا ہے جبکہ میرے خیال میں اسے ان سے محترز رہنا چاہیئے۔ ابھی میں اپنی تجاویز کو معرض التوا میں رکھوں گا۔ اور جب میں جھاڑ جھنکاڑ صاف کر کے اس کے لیے زمین ہموار کر لوں گا تو پھر میں اسے وہ "پتے" کے بیج بکھیروں گا جس کے خنداں خنداں غنچے اس کے لئے مسرت اور شادمانی کا پیام لائیں گے۔

میں اس کے ساتھ انصاف سے کام لیتے ہوئے یہ فرض کرتا ہوں کہ وہ دفتر جانے کی تیاری میں بہت کم وقت ضائع کرتا ہے۔ اکثریت کی صورت میں وہ سردیوں میں آٹھ بجے بستر سے باہر آ جاتا ہے اور ۷ء۵ اور ۹ء۲ بجے کے درمیان وہ اپنا ناشتہ کر لیتا ہے۔ اس کے بعد کپڑے بدل کر ۰۱ء۸ پر چل ہی وہ

گھر سے باہر نکلتا ہے اور اس کے پیچھے گھر کا دروازہ کھٹاک سے بند ہو جاتا ہے تو اس کے بعد سے اس کے ذہنی قویٰ — جو بے تکان کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں — جیسے سست اور کاہل ہو جاتے ہیں اور بس سٹاپ پر پہنچنے تک اس کا ذہن بالکل ماؤف سا ہوتا ہے۔ بس سٹاپ پر پہنچنے کے بعد عموماً اسے بس کا انتظار کرنا ہوتا ہے۔ لاہور میں یہ نظارہ عام ہے اور آپ شہر کے سینکڑوں بس سٹاپوں پر لوگوں کو صبح سویرے بڑے اطمینان اور سکون سے ادھر ادھر ٹہلتے دیکھ سکتے ہیں اور کیا پتہ آپ بھی ان ہی میں سے ایک ہوں۔ ادھر بس والے ہیں کہ روزانہ لوگوں کا قیمتی وقت لوٹتے ہیں اور ہر روز سرمایہ سے بھی زیادہ قیمتی وقت کے ہزاروں لاکھوں گھنٹے محض اس وجہ سے ضائع ہو جاتے ہیں کہ لوگ وقت کا خیال ہی نہیں کرتے اور آج تک یہ ضرورت ہی نہ محسوس کی گئی کہ یوں وقت ضائع جانے کے خلاف کوئی احتیاطی تدابیر ہی اختیار کی جائیں۔

اس کے پاس تمام دن میں ایک خاص قیمت اور مالیت کا وقت ہے جسے اس نے خرچ کرنا ہوتا ہے۔ چلیں آپ اس کی قدر کو دس روپے کہہ لیں۔ اب اس نے دس کے اس بندھے نوٹ میں سے ریزگاری بھی لینی ہوتی ہے۔ لیکن اس ریزگاری کے سلسلہ میں اس سے کتنے ہی زیادہ پیسے ہتھیا لیے جاتے ہیں اسے اس کا کبھی احساس نہیں ہوتا ہے۔

فرض کیجیے بس کا کنڈکٹر اسے ٹکٹ دیتے وقت کہتا ہے۔ "ہم دس روپے کے نوٹ کی ریزگاری تو دے دیں گے مگر آپ سے اس کے معاوضہ میں

وہ آنے بھی لیں گے۔" اب آپ اس کے جواب میں کیا کہیں گے؟ یہ لطیفہ ویسا ہی ہے جیسا بس والے دن میں دونوں وقت پانچ منٹ ضائع کرتے ہیں۔ گو آپ کو اس کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ میں ان جزئیات میں نہیں الجھنا چاہتا اور بعد میں یوں ضائع کیا گیا تمام وقت وصول کروں گا۔

اجی حضرت! اب آپ اخبار خریدیے اور بس میں سوار ہونے کی کوشش کریں — ورنہ زیادہ رش ہو گیا تو پھر اگلی بس کا انتظار کرنا ہوگا اور یا دروازے میں لٹک کر جانا ہوگا۔

فلم کا شو اور غیر فانی روح

آپ اپنی بس میں سوار ہو جاتے ہیں۔ آپ کی بغل میں تازہ اخبار ہے اور آپ بڑے اطمینان اور ایک شانِ استغنا سے سیٹ پر بیٹھ کر (اگر بیٹھنا نصیب ہو) اخبار بینی شروع کر دیتے ہیں۔ آپ بڑے سکون سے ایک ایک سرخی اور اس کے بعد خبر کو پڑھتے ہیں۔ کیونکہ آپ جلدی میں نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ سفر کم از کم نصف گھنٹہ تو ضرور ہی لے گا۔ جب آپ کا طائرانہ انداز سے "ضرورتِ رشتہ" کے اشتہارات اور قتل و اغوا کی خبروں پر نظر دوڑا رہے ہوتے ہیں تو آپ کے بشرہ سے جہاں آبدہ ایسے امن و سکون کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آپ وقت کی دولت سے مالا مال ہیں جیسے آپ کے پاس گھنٹوں منٹوں اور سیکنڈوں کے انبار لگے ہیں جیسے آپ کا ورود کسی ایسی دنیا سے ہوا ہے جہاں ایک دن چوبیس[24] گھنٹوں کا نہیں بلکہ ایک سو چوبیس[124] گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ میں بھی اخبارات کے مطالعہ کا دلدادہ ہوں اور میں دو انگریزی اور تین اردو

روزناموں کا مطالعہ کرتا ہوں اور یہ تو میرا ہاکر ہی آپ کو بتا سکے گا کہ میں کتنے ہفت روزہ اور ماہوار رسالے مستقل طور سے خریدا کرتا ہوں۔ یہ میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ میں آپ پر اپنی علمیت کا رعب جھاڑنا چاہتا ہوں۔ بلکہ اس سبب سے کہ کہیں اخبار بینی کی مندرجہ بالا مثال سے آپ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں کیونکہ خود اخبار نہیں پڑھتا اس لیے میں اس کے بارہ میں متعصبانہ ذہنیت رکھتا ہوں۔ اخبارات جلدی کی چیز ہیں وہ اسی لیے جلد از جلد شائع کیے جاتے ہیں کہ انہیں جلد از جلد پڑھ کر ختم کیا جائے اس لیے میں نے اپنے لیے مرتب کردہ لائحہ عمل میں اخبارات کے لیے کوئی مخصوص وقت نہیں معین کیا بلکہ میں تو اپنی سہولت کے مطابق وقت لے کر ان کا مطالعہ کرتا ہوں لیکن میں ان کا مطالعہ کرتا ضرور ہوں۔ مگر میں اپنے وقت میں سے تیس چالیس منٹ کسی صورت سے بھی صرف اخبار بینی کے لیے وقف نہیں کر سکتا۔ کیونکہ صبح کا تو یہ وہ وقت ہے جب آپ مکمل طور سے اپنی ذات میں گم ہو سکتے ہیں (کیونکہ مسافروں سے بھری ہوئی بس ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر آدمی اپنی اپنی سیٹ پر اپنے لیے خلوت کا ایک ماحول پیدا کر کے "محشر خیال" بپا کر سکتا ہے) اور میرے لیے تو یہ خیال ہی سخت تکلیف دہ اور کوفت پیدا کرنے والا ہے اسی لیے میں آپ کو بھی الف لیلیٰ کے شہزادوں کی سی فیاضی کے ساتھ اپنے وقت کے بیش قیمتی موتی یوں لٹانے کی ہدایت نہ کروں گا۔ یاد رکھیے! آپ شہنشاہِ وقت نہیں! اور اگر آپ کسی ایسی ہی خوش فہمی میں مبتلا ہیں تو میرے حضور! میں آپ کی خدمت میں ایک مرتبہ پھر بصد ادب یہ گزارش کروں گا کہ آپ بھی میرے اتنے ہی وقت کے مالک ہیں اور ہم دونوں کا وقت مل کر اڑتالیس گھنٹے نہ بنے گا۔ بلکہ

یہ چوبیس چوبیس گھنٹے رہی رہے گا ــــ اس لیے بسوں میں اخبار بینی بند! کیونکہ میں پہلے سے ہی تقریباً پون گھنٹہ زیادہ بہتر مصرف کے لیے مخصوص کر چکا ہوں۔

اب آپ اپنے دفتر پہنچ گئے ہیں اور میں دفتر سے چھٹی ہونے تک آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ آپ کو آدھ پون گھنٹہ کا وقفہ استراحت بھی ملتا ہے۔ مگر جانیے! یہ وقت بھی میں آپ ہی کے حوالہ کرتا ہوں یہ آپ کی مرضی ہے۔ آپ اسے اپنے دل پسند طریقہ سے خرچ کر سکتے ہیں۔ بلکہ آپ اس وقت کو اخبار بینی کے لیے کیوں نہیں وقف کر لیتے؟

اچھا! تو آپ کو چھٹی ہو گئی؟ آپ کے چہرہ کا رنگ زرد ہے اور اس سے تھکان اور اضمحلال کے آثار ہویدا ہیں ویسے ایک بات ہے خواہ آپ تھکے ہوں یا نہ ہوں مگر بیوی کو آپ تھکے تھکے ہی نظر آئیں گے۔ اور جب وہ پوچھے گی کہ آپ کا چہرہ اترا اترا سا نظر آ رہا ہے تو آپ اسے یہی بتائیں گے کہ میں تھکا ہوا ہوں۔ دفتر سے گھر واپس جانے کے دوران آپ بتدریج اپنے آپ پر احساس تھکان کو مسلط کرنے جاتے ہیں۔ بلکہ تھکن اور ماندگی کی فضا تو تمام لاہور پر ہی ــــ خصوصاً گرمیوں میں ــــ سیاہ گھٹاؤں کی مانند چھائی رہتی ہے۔ آپ گھر پہنچتے ہی کھانا نہیں کھاتے بلکہ گھنٹہ سوا گھنٹہ آرام کرنے کے بعد آپ اشتہا محسوس کرتے ہیں ورنہ اس سے پہلے تو آپ میں ہلنے کی بھی سکت نہیں ہوتی ہے۔ خیر آپ کھانا تناول کرنے کے بعد حقہ یا سگرٹ سے دل بہلاتے ہیں ــــ دوستوں سے ملتے ہیں، تاش کی بازی لگاتے ہیں ــــ گھر کے بیکار معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہیں ــــ کتاب پڑھتے ہیں ــــ سیر کرتے ہیں، ریڈیو سیلون سے گانے سنتے ہیں یا اسی احساس

سے بیٹھے کڑھتے رہتے ہیں کہ اب بڑھاپا آ رہا ہے۔

——— اور تب آپ اچانک سر اٹھا کر گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہیں "اوہ! اپو نے گیارہ بج گئے!" اور آپ سو جانے کے متعلق سوچتے ہیں ——— سوچتے ہیں اور سوچتے ہی رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک لمبی چوڑی جمائی سے آپ کو وقت گزرنے کے ساتھ نیند آجانے کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور آپ دن بھر کے کام سے تھکے ماندے بستر پر ایک بے جان شہتیر کی مانند دھڑام سے گر پڑتے ہیں اور ——— تھوڑی دیر کے بعد آپ کے خراٹے گھر بھر میں گونج رہے ہوتے ہیں۔ دفتر سے نکلنے کے بعد آپ کا کتنا وقت یوں ہی ختم ہو گیا۔ جیسے تیز ہوا کسی خزاں رسیدہ پتے کو اڑا لے جائے ——— جیسے کوئی خواب ہو ——— جیسے کسی جادوگر کی پھونک سے وہ سب ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اور ظلم تو یہ ہے کہ آپ نے ضائع شدہ گھنٹوں کو گن تک بھی نہیں۔

یہ ایک سیدھی سادی سی مثال تھی لیکن آپ یہ کہہ سکتے "جی ہاں، باتیں بنانا تو بہت آسان ہوتا ہے۔ لیکن انسان مشین تو ہے نہیں۔ سارے دن کے کام کے بعد وہ تھک جاتا ہے۔ آخر وہ اس دنیا میں رہتا ہے اور اس کے وقت پر دوست احباب کا بھی حق ہے آخر وہ ہمیشہ تیر کمان کی طرح سے کسا کسایا بھی تو نہیں رہ سکتا ہے۔

——— لیکن آپ یہ بھول گئے کہ جب آپ سینما جانے کا پروگرام بناتے ہیں ——— ایسی صورت میں جبکہ آپ کی محبوبہ نے بھی آپ کے ساتھ جانا ہو تو کیا ہوتا ہے؟ آپ اپنے کپڑوں پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ جوتے چمکائے جاتے ہیں، ٹائی کی

ناٹ بار بار درست کی جاتی ہے۔ کریم اور سنو سے "ملیح" چہرہ کو "صبیح" کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ شاہدرہ سے ۹ نمبر بس پر تیس ہزاری کے سٹاپ پر آتے ہیں وہاں سے ایک اور (جو بس بھی ملے اور اگر وہ نہ ملے تو تانگہ) پکڑ کر آپ دہلی تشریف لاتے ہیں۔ یہاں کے بس سٹاپ پر آپ کی "جانِ تمنا" نے ملنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ آپ اس پروگرام کی خاطر کئی گھنٹے افزا تفری میں گزارتے ہیں اور آپ کو تھکن، احباب یا ضروری کام کچھ بھی تو نہیں یاد آتا ہے اور جب آپ رات کو ساڑھے دس بجے گاڑی سے واپس شاہدرہ اپنے گھر پہنچتے ہیں تو بستر پر لیٹ کر اس ملاقات کے تصور سے آپ کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وقت کتنی جلدی ختم ہو گیا اور کیا آپ وہ دن بھول گئے جب آپ کے دفتر کی بزمِ تمثیل کے زیرِ اہتمام ہونے والے ڈرامہ میں آپ کا بھی پارٹ تھا اور آپ نے مسلسل تین ماہ ہر شب دو گھنٹے لگا کر مکالمے یاد کیے اور تمام ریہرسلوں میں حصہ لیا — اور کیا آپ اس حقیقت کو جھٹلا سکتے ہیں کہ جب آپ نے شام کو کوئی خاص کام کرنا ہو — کوئی ایسا کام جس کے لیے آپ کی تمام ذہنی صلاحیتوں اور جسمانی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے — تو کیا تمام دن اس کا خیال آپ کے ذہن پر مسلط نہیں رہتا؟ آپ آنے والے کام سے وابستہ تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تمام دن خود کو تیار کرتے رہتے ہیں اور یوں آپ کی توانائی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ آپ میں ایک عجیب قسم کی پھرتی، چستی اور تیزی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

میرا کہنے کا یہ مقصد ہے کہ شام کو دفتر سے نکلنے کے بعد آپ ہمت سے کام لیں — حقائق سے آنکھیں چار کریں اور یہ تسلیم کر لیں کہ آپ تھکے نہیں کیونکہ

آپ واقعی نہیں تھکے ہوتے ۔۔۔ اور آپ اس سے واقف ہیں) اس کے بعد آپ اپنی شام کے لائحہ عمل کو اس انداز سے مرتب کریں کہ رات کے کھانے سے اس کے تسلسل میں رکاوٹ نہ پیدا ہو سکے۔ ایسے کرنے سے آپ کے پاس کم از کم تین گھنٹوں پہ مشتمل ایسا وقت ہوگا۔ جس کا تسلسل اور "روانی" آپ کے لیے افادہ بخش ثابت ہو گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ہر شب کے تین گھنٹے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو صیقل کرنے کے لیے ہی وقف کر دیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ ضرور ایسا کرنا شروع کر دیں۔ آپ ایک دن چھوڑ کر ہر شام کے ڈیڑھ گھنٹوں کو کسی اہم دماغی کام کے لیے وقف کر دیں۔ ایسا کرنے کے باوجود بھی آپ کے پاس ہفتہ میں تین شامیں ایسی ہوں گی جن میں آپ دوستوں سے مل سکتے ہیں ۔۔۔ برج یا ٹینس کھیل سکتے ہیں ۔۔۔ بیوی سے لڑ سکتے ہیں ۔۔۔ الٹی سیدھی کتابیں اور رسالے پڑھ سکتے ہیں ۔۔۔ (اگر کوٹھی ہو تو) باغیچہ کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں ۔۔۔ معمے حل کر سکتے ہیں اور اپنے صدہا اشغال سے دل بہلا سکتے ہیں۔ بلکہ اتوار کا سارا دن بھی آپ ہی کا غلام ہے۔ اس وقت کو بھی جیسے چاہیں ضائع کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ نے دل کڑا کر کے ہفتہ کی دوسری تین شامیں کسی اہم دماغی کام کے لیے وقف کر دیں اور ان پہ دیانت داری اور مستقل مزاجی سے کاربند رہے تو آپ جلد ہی چوتھی بلکہ شاید پانچویں ۔۔۔ شام کو بھی اسی فہرست میں شامل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ آپ میں زندہ رہ کر زندگی گزارنے کی امنگ موجود ہے اور سونے کا وقت آئے گا تو آپ اس کے متعلق کچھ نہ سوچیں گے۔ کیونکہ وہ آدمی جو بستر پہ لیٹنے سے قبل آدھ پون گھنٹہ سونے کا موڈ بنانے ہی میں گزار دیتا ہے تو

اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ بور ہے یہ الفاظ دیگر وہ زندہ رہ کر زندگی نہیں گزار رہا ہے۔
لیکن ایک بات یاد رہے — پہلے دن اور لمحۂ آغاز سے ہی آپ یہ تصور کرلیں کہ دس ہزار اسی منٹوں میں سے ہے۔ ایک ہفتہ کے یہ تین شبینہ نوّے منٹ بے حد اہمیت اور قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ اور انھیں آپ اتنا ہی "مقدس" جانیے جتنا آپ ڈرامہ کی ریہرسل فلم یا بیڈمنٹن کے پیچ کو گردانتے ہیں۔ جب آپ فلم جا رہے ہوں اور راستہ میں کوئی دوست مل جائے تو آپ یہ کہتے ہیں:

"یار! معاف رکھنا۔ میں فلم پر جا رہا ہوں۔ پھر ملیں گے!"

اس طرح آپ کو یہ کہنا چاہیے — "مجھے کام کرنا ہے۔"

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ایسا کرنا اور کہنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ آپ کے نزدیک تو غیر فانی روح کے مقابلہ میں فلم شو زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

آرام کا حسن

پچھلے باب میں اتفاقاً اتوار کی چھٹی کا تذکرہ ہو گیا تھا۔ ہفتہ کو دفتر سے نکلنے کے بعد پیر کی صبح کو دفتر جانے کے وقت تک آپ بالکل فارغ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر میں اس مسئلہ کا بھی جائزہ لینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک ہفتہ کارکردگی کے چھ یا سات دنوں کا ہو؟ ایک طویل مدت تک —— جبکہ میں چالیس سال کا ہو رہا تھا —— میرا ہفتہ سات دنوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اور میرے بزرگ اور دیگر عقلمند حضرات بھی کہا کرتے تھے کہ سات کی بجائے چھ دنوں سے بھی زیادہ کام الحمد للہ کی رو سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ الحمد اب جبکہ سات دنوں میں سے میرے پاس ایک دن ایسا ہوتا ہے جس کے لیے میں نے مخصوص لائحہ عمل نہیں بنا رکھا بلکہ من کی لہر الحمد جی کی موج کے مطابق جو دل چاہے وہی کرتا ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ میں ہفتہ میں آرام کے لیے مخصوص کیے گئے ایک دن کی اخلاقی اہمیت کا قائل ہو چکا ہوں لیکن اس کے باوجود اگر آج بھی میرے سامنے اپنی زندگی کی ترتیبِ نو کا مسئلہ درپیش ہو

تو میں پہلے ایسا رویہ ہی اختیار کروں گا۔ کیونکہ صرف وہی انسان جو ایک طویل مدت تک ہفتہ کے ساتوں دنوں میں خون پسینہ ایک کرتا رہا ہو وہی بعد میں اس قسم کے مسلسل آرام و سکون کے حسن اور جاذبیت کو محسوس کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں میں تو اب بہارِ شباب گزار چکا ہوں اور کہن سالی کی آمد آمد ہے اور اس ضمن میں عمر بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن اگر آپ کے قویٰ میں اضمحلال نہیں پیدا ہوا ——— اگر جسم میں قوت اور رگوں میں گرم خون دوڑتا ہے تو میں بلا کسی جھجک آپ کو کام کرنے ہی کا مشورہ دوں گا۔ رُت آئے چلی جائے ——— پت جھڑ ہو یا غنچے مسکرائیں ——— سورج آگ برسا رہا ہو یا خنک چاندنی کی سیمیں کرنیں رقص کناں ہوں ——— آپ اپنے کام سے مطلب رکھیں!

لیکن ایک آدمی کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے لائحہ عمل کو چھ دنوں تک ہی محدود رکھے۔ اگر آپ اس لائحہ عمل کو اتوار پر بھی لاگو کرنا چاہتے ہیں ——— اور اسے سنبھالنے کی استعداد ہے۔ تو ضرور ایسا کیجیے۔ لیکن صرف اپنی خواہش اور استعداد کے مطابق ہی کیجیے اور باقی بچے ہوئے فالتو وقت کو اپنی آمدنی نہیں بلکہ "غیر متوقع منافع" تصور کریں تاکہ جب پیر کو آپ کے چھ دنوں والے کارکردگی کے ہفتہ کا آغاز ہو تو آپ کے دل میں اپنی "عزلت" یا "پسماندگی" کا احساس نہ ہو۔

آیئے! اب ذرا آپ کی حیثیت کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ ابھی ہم نے "بچت" کے جذبہ کے تحت دل میں "فضول خرچ" ہو جانے والے اوقات کا حساب کیا تھا۔ ہفتہ کے چھ دنوں میں (اخبار بینی والا) روزانہ کا نصف گھنٹہ اور ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ کی تین مثالیں ——— ان کا ٹوٹل ایک ہفتہ میں ساڑھے سات گھنٹے

بنتے ہیں۔

میرے خیال میں موجودہ حالت میں صرف ان ساڑھے سات گھنٹوں ہی پہ اکتفا کافی ہوگی ۔۔۔ ار ہے ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ کیا ؟ آپ تو چلا اُٹھے ۔۔۔ "تم ہمیں تو کہتے ہو کہ میں زندہ رہنے کا گر بتاتا ہوں اور اب ایک ہفتہ کے ۱۶۸ گھنٹوں میں سے صرف ساڑھے سات گھنٹوں پہ اکتفا کر رہے ہو ۔۔۔ اور پھر ان ساڑھے سات گھنٹوں سے کون سا پہاڑ ڈھا لینا ہے ۔۔۔ یا کوئی معجزہ دکھا دینا ہے ؟"

دیکھئے صاحب ! آپ ابتدا سے ہی تمام معاملہ کو گڈمڈ کرنے کی کوشش تو نہ کیجئے یہ ٹھیک ہے کہ میں پہاڑ نہ ڈھاؤں گا ۔ لیکن میں کم از کم اس سے چھوٹا موٹا معجزہ تو دکھا ہی دوں گا ۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ تعاون سے کام لیتے ہوئے ذاتی طور سے اس کا تجربہ کرنے کی تکلیف گوارا کر لیں ۔ گو یہ ترکیب بالکل فطری اور قابل تجربہ ہے مگر نتائج کے اعتبار سے یہ کسی معجزہ اور کرامت سے کم نہیں ۔ اس بارہ میں میرا یہ نظریہ ہے کہ ان ساڑھے سات گھنٹوں پر مشتمل اوقات کو پوری طرح بروئے کار لانے سے آپ کے تمام ہفتہ میں جیسے زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ جائے گی جس سے پیدا شدہ جوش اور سرگرمی آپ کو زندگی میں دلچسپیوں کے متنوع انداز سے روشناس کرائے گی ۔ آپ صبح اور شام کو صرف دس منٹ کے لئے ہی ورزش کرتے ہیں ۔ لیکن اس سے آپ کو کتنا فائدہ حاصل ہوتا ہے ۔۔۔ آپ کی جسمانی صحت بہت اچھے انداز سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے خوشگوار اثرات تمام دن ہی کسی نہ کسی طریقہ سے محسوس

ہوتے رہتے ہیں۔ بلکہ تمام زندگی کے بارہ میں آپ کا نقطۂ نظر ہی تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر اگر میں نے آپ سے ہفتہ میں ہر روز ایک گھنٹہ سے زیادہ ذہنی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لیے مخصوص کرنے کو کہا تو آپ کیوں اتنے حیران ہو رہے ہیں۔ اجی حضرت! دماغ کے لیئے روزانہ ایک گھنٹہ روزانہ مخصوص کرنے سے آپ کی ذہنی کارکردگی میں جو اضافہ ہوگا اس سے آپ کی تمام زندگی سود مند اثرات اخذ کرے گی۔ یہ اثرات وقتی اور ہنگامی نہ ہوں گے۔ بلکہ ان سے تمام زندگی مستقل طور سے متاثر ہوگی۔

آپ اپنی ذاتی بہبود کے لیئے یقیناً زیادہ وقت صرف کر سکتے ہیں۔ اور جتنا زیادہ وقت صرف کیا جائے گا نتائج اتنے ہی خوشگوار اور دور رس ثابت ہوں گے۔ لیکن میں اس کا آغاز چھوٹے پیمانے پر معمولی سعی سے کرنا چاہتا ہوں۔

ژرف نگاہی سے اس کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ یہ "چھوٹے پیمانہ پر معمولی سعی" نہیں ہے۔ جب آپ اسے شروع کریں تو آپ پر بھی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ ہفتہ کے دو گھنٹے جو کسی گھنے جنگل کی مانند آپ کی زندگی پر محیط رہتے ہیں۔ ان میں سے ساڑھے سات گھنٹوں کے لیے "جگہ بنانا" اچھا خاصا مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس کے لیے آپ کو کسی نہ کسی چیز کی قربانی دینی پڑیگی۔ ہو سکتا ہے کوئی صاحب اپنا وقت خراب طریقہ سے ہی بسر کرتے ہوں۔ لیکن وہ اسے کسی نہ کسی مخصوص انداز سے تو گزارتے ہیں اور اسی دوران میں وہ — اچھا یا برا — کچھ نہ کچھ کرتے تو ہیں۔ ہم ان کی وقت کٹی کے کام یا مشغلہ کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جو آدمی اس کا عادی ہو چکا ہے

اس کے لیے تغیر ناگواری کے پہلو کا حامل ہو گا۔ کیونکہ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ اسے اپنی عادت میں تبدیلی کرنا ہو گی ــــ اور یہ اکثر لوگوں کے لیے ناخوشگواری کا باعث ہوتا ہے۔ عادت تغیر کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ علاوہ ازیں ہر تغیر ــــ خواہ وہ بہتری اور بہبودی کے لیے کیوں نہ ہو ــــ کی وجہ سے بعض دقتوں اور بے آرامیوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر آپ کو یہ توقع ہے کہ آپ ہفتہ بھر ساڑھے سات گھنٹوں کے لیے سنجیدہ قسم کا دماغی کام مستقل طور سے کرنے کے بعد بھی اپنی پرانی عادتوں کو اپنائے رکھیں گے تو یہ توقع اپنے دل سے نکال دیجیے اور میں ایک مرتبہ پھر جتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کے لیے کچھ قربانی اور قوتِ ارادی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ میں ان صورتوں میں ناکامی کے تلخ اور مضر نتائج کو سمجھتا ہوں اسی لیے میں اس پر مُصر ہوں کہ آپ کا آغاز بہت تھوڑے سے وقت سے ہونا چاہیئے تاکہ آپ خود پر کسی قسم کا بوجھ نہ محسوس کریں۔ لیکن ایک بات ہے ــــ آپ کو ہر قیمت پر عزت نفس کو برقرار رکھنا ہو گا۔ اس قسم کی ارادیت کی تہ میں ہمیشہ عزت نفس کام کرتی نظر آتی ہے۔ جب آپ خلوص محنت اور شوق سے ایک کام کو شروع کریں گے اور پھر اس میں بھی آپ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے ــــ وجوہات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ تو اس سے آپ کے پندار کو ٹھیس پہنچے گی اور آپ کی انا مجروح ہو جائے گی۔ اسی لیے میری آپ کو اولیں نصیحت یہی ہے۔ آپ خاموشی اور سکون سے کام کا آغاز کریں۔

جب آپ تین ماہ تک یقین محکم اور عمل پیہم سے کام لیتے ہوئے ہفتہ میں ساڑھے سات گھنٹوں کے لیے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے میں مصروف

رہیں ۔ اور اس میں کامیاب ہو جائیں تو اس وقت آپ کے لیئے اپنے حالات اور کارگزاری کا جائزہ لینے کے بعد خود یہ تہیہ کرنا جائز ہو گا کہ میں کیا کیا کارنامے سرانجام دے سکتا ہوں ۔

پیشتر اس کے کہ میں آپ کو ان گھنٹوں کے موزوں اور مناسب استعمال کے لیے طریق کار بتاؤں ۔ میں آپ کو ایک آخری ہدایت دینا ضروری سمجھتا ہوں ۔ شام کو اپنے لیے مخصوص کردہ وقت میں آپ جو کام بھی کرنا چاہیں اس کے لیے اگر ضرورت پڑے تو نوّے منٹ سے زیادہ بھی لے لیں ۔ اس ضمن میں ہنگامی حالات اور حادثات کو نہ بھولنا چاہیے ۔ پھر انسانی فطرت کے تقاضوں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے ۔ اس لئے اپنے نوّے منٹوں کے کام کے لیے بطور مثال — نو سے ساڑھے گیارہ بجے تک کا وقت مخصوص کریں ۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ ڈیڑھ گھنٹہ کے کام کے لئے ڈھائی گھنٹے مخصوص کرنے کے بعد نفسیاتی لحاظ سے آپ اپنے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ نہ محسوس کریں گے نہ آپ کو پتہ ہو گا کہ اس کام کے لئے تو ڈھائی گھنٹہ ہیں اس لیے کشادگیٔ وقت کے احساس سے آپ کو وہ کام طویل اور مشکل نہ محسوس ہو گا ۔ اسی احساس کی بنا پر آپ اس کام کو بڑے ہلکے پھلکے انداز سے کر لیں گے اور جلد ہی یہ دیکھیں گے کہ جس کام کے لیے ڈھائی گھنٹے مخصوص کئے تھے آپ نے اسے نسبتاً کم عرصہ میں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچا لیا ہے ۔ اس سے جہاں آپ کے دل میں مسرت اور بالیدگی کے احساسات جنم لیں گے وہاں آپ میں خود اعتمادی بھی پیدا ہوتی جائے گی اور یوں آپ اس کام سے دلچسپی لینی شروع کر دیں گے ۔ اور یہ دلچسپی بھی حقیقی اور اساسی نوعیت کی ہو گی ۔

۱

وحشی گھوڑے کے منہ میں لگام

لوگ کہتے ہیں " اپنے خیالات کی رو کو قابو میں رکھنا ناممکن ہے۔ خیالات کی ندی کے دھارے ایسے تند اور وحشی ہیں کہ ان پر لاکھ بند باندھو مگر یہ چل دیے جاتے ہیں "

مگر میں ایسے لوگوں سے متفق نہیں ہوں!

ذہن اور قوائے متخیلہ کو قابو میں رکھنا مشکل اور ناممکن کام نہیں ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم بیرونی دنیا کے تاثرات اور حسیات کے تہیجات کا اور اک دماغ ہی سے کرتے ہیں اس لحاظ سے جو کچھ ہے دماغ ہی کے اندر ہے۔ دماغ مفلوج ہو جائے تو انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی بیرونی دنیا کے لیے مر جاتا ہے۔ اسی طرح سامانِ اندوہ اور ہنگامۂ نشاط بھی ذہن ہی کے باعث ہیں۔ ہمارے جذبات اور احساسات اور محسوسات سبھی ذہن کی شعبدہ بازی ہونے کی بنا پر دماغ سے عبارت ہیں۔ اس لیے آپ اگر

چاہیں تو اسی پُراسرار طلسم خانہ پر قابو حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس سحر سامری کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ آپ اپنے خیالات اور جذبات پر قابو پالیں ۔۔۔ یہ میں نے کوئی نیا طریقہ نہیں پیش کیا۔ بلکہ یہ عقل و دانش کے قدیم ترین نظریات میں سے ہے۔ لیکن سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ اس نظریہ کی وقعت اور اہمیت کو سمجھے بغیر ہی لوگوں کی کثیر تعداد اپنی زندگی گزار دیتی ہے اور جب ان کا وقت پورا ہو جاتا ہے اور آخری وقت آجاتا ہے تو وہ بڑی خاموشی سے پکے ہوئے پھل کی مانند شاخِ حیات سے گر پڑتے ہیں۔

اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ اپنی توجہ کو کسی مخصوص مسئلہ پر مستقل طور سے مرکوز نہیں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی سعی کے بغیر ان میں یہ قوت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ یاد رکھیے! اگر آپ بھرپور زندگی بسر کرنے کے خواہاں ہیں تو توجہ مرکوز کرنا اس ارفع ترین قصر کی تعمیر کے لیے ۔۔۔ جسے زیست کہتے ہیں ۔۔۔ خشتِ اوّل کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اس قوت کا یہ مطلب ہے کہ آپ اس وحشی گھوڑے کے منہ میں لگام دے کر اسے تابعداری اور فرمانبرداری کا درس دیتے ہیں اور یوں آپ اس سے اپنی پسند کا کام لیتے ہیں۔ اس لیے ایک مکمل اور کامران زندگی کے لیے ذہن پر قابو پانا لازمی اور ناگزیر ہے۔

اس لیے میرے خیال میں دن کا سب سے پہلا کام اپنے ذہن پر قابو پا کر اس کی بے ہنگم رفتار کو درست کرنا ہے۔ آپ اپنے جسم کی کتنی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ آپ اس کی صفائی اور حفاظت کے لیے کیا کیا اہتمام نہیں کرتے۔

آپ جلد سے بال اتارنے میں کئی طرح کے خطرات مول لیتے ہیں۔ آپ کے پیٹ کے لیے متنوع قسم کا ایندھن درکار ہے اور ایک شیر فروش سے لے کر قصائی تک کتنے ہی لوگ ہیں جو کام و دہن کے چٹخارے کے لیے نت نئے سامان مہیا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد بھی آپ اچار، چٹنیوں، مربوں اور چورن کی صورت میں معدہ کو طرح طرح کی رشوت دیتے رہتے ہیں۔ کہ کہیں وہ موقع بے موقع اکڑ نہ بیٹھے ——— لیکن آپ کو ذہن کا کبھی نہیں خیال آتا ——— آپ کے ذہن پر معدہ تو چھایا رہتا ہے۔ مگر کبھی ذہن پہ ذہن کیوں نہیں چھاتا۔ حالانکہ ساخت کے اعتبار سے یہ بے حد نازک ہے اور پھر آپ کو تو اس کی پرداخت کے لیے بیرونی مرچ مصالحوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ زندگی گذارنے کے ڈھنگ اور فنِ زیست سے وابستہ یہی وہ شعبہ ہے جس کے لیے میں نے دفتر سے واپسی کے بعد کا وقت مخصوص کر رکھا ہے۔

مگر آپ چلا اٹھتے ہیں۔

"ہیں! یہ کیا ——— ؟

کیا میں اپنے ذہن کی تربیت سڑکوں پر کرتی ہے؟ کیا میں اپنے ذہن کی پرداخت کھچا کھچ بھری ہوئی بس میں کروں گا؟ اور کیا میں اپنی ذہنی نشوونما شوروغل والے بازاروں اور چیختے چلاتے بچوں سے بھری ہوئی گلیوں میں کروں گا؟"

جی ہاں!

اجی قبلہ! اس سے بڑھ کر آسان ترین کام بھی کوئی اور ہو سکتا ہے ———

نہ اوزاروں اور آلات کی حاجت — نہ لیبارٹری اور لائبریری کی ضرورت — نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے!

..... — تاہم یہ معاملہ آسان بھی نہیں ہے۔

جب صبح کو آپ اپنے گھر سے نکلیں تو آپ کسی بھی موضوع پر اپنے ذہن کو مرکوز کر دیں — اس کے لیے کسی مخصوص موضوع یا مسئلہ کے چناؤ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جو دل چاہے اس پر ہی توجہ مرکوز کر دیجئے! آپ مشکل سے دس قدم ہی چلیں ہوں گے کہ آپ کا ذہن آپ کو جُل دے کر کسی اور ہی مسئلہ میں جا اُلجھے گا — آپ اسے گردن سے قابو کریں اور اسے پہلے موضوع پر واپس لے آئیں۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا اور آپ کی اور ذہن کی یہ آنکھ مچولی جاری رہے گی۔ اور حالت یہ ہوگی کہ بس سٹاپ پر پہنچنے تک آپ کو کم از کم اسے چالیس مرتبہ گھسیٹ کر اصل موضوع کی طرف لانا پڑے گا۔ لیکن آپ خفا ہو کر جی چھوٹا نہ کریں۔ بلکہ اس "آنکھ مچولی" کو جاری رکھیں اور اس سیماب یا ذہن کے چھل میں نہ آئیے! مسلسل کوششوں کے بعد وہ وقت بھی آئے گا۔ جب یہ ذہن آپ کے ساتھ ایک وفادار کتے کی طرح سے دُم ہلاتا ہوا چلے گا۔ اور یاد رکھیے! ہمت نہ ہارنے کی شرط ہے۔ کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک شریر بچہ کی طرح ذہن نچلا نہیں بیٹھتا۔ مگر پھر بھی آپ اس غلط فہمی میں مت مبتلا رہیئے کہ آپ کا ذہن مستقل طور سے کسی نکتہ پر مرکوز ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا آپ وہ دن بھول گئے جب دفتر میں EXPLANATION کے جواب میں آپ کو

بہت محتاط ہو کر اور ایک ایک لفظ کے متعلق سوچ کر لکھنا تھا۔ کیسے آپ کا ذہن اسی ایک محور پر گردش کناں رہا۔ کیا مجال جو ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کی توجہ ادھر اُدھر منعطف ہوئی ہو۔ دفتر پہنچنے تک آپ اس کے جواب کے بارہ میں سوچتے رہے تھے اور دفتر پہنچتے ہی آپ نے سب سے پہلے اسی کا جواب تحریر کیا۔ یہ مثال ایسی ہے جس میں حالات کے تحت آپ اتنے گھبرائے ہوئے اور پریشان تھے کہ آپ نے اپنے ذہن کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک جابر آقا اپنے زرخرید غلام کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ آپ نے ذرا سا بھی تساہل نہ گوارا کیا۔ آپ نے اس کام کو کرنا چاہا۔ اور وہ کام ہو گیا۔

اگر مسلسل مشق سے آپ ذہن کو ایک ہی مسئلہ پر مرکوز رکھنے میں کامیاب ہو گئے (یاد رکھیے اس کے لیے کوئی خاص اصول یا قواعد و ضوابط نہیں ہیں بلکہ صرف مستقل مزاجی، سعی مسلسل اور عملِ پیہم کی ضرورت ہے) تو آپ اپنے ذہن پر (جو کہ آپ سے اعلیٰ اور برتر نہیں) اس حد تک قابو پا لیں گے کہ آپ اس سے جس وقت اور جس جگہ بھی چاہیں کام لے سکیں گے۔ اس کے لیے "مشق" یا "ورزش" بے حد سہل ہے۔ اگر آپ ورزش کے لیئے ڈمبل یا علمیت میں اضافہ کے لیے کسی انسائیکلوپیڈیا کی دس پندرہ جلدیں بغل میں دبا کر بس میں سوار ہوتے ہیں تو لوگ نہ صرف آپ پر ہنسیں گے بلکہ کوئی من چلا آپ کو ہمبر کی بس پر سوار ہونے کا مشورہ بھی دے بیٹھے گا۔ لیکن جب آپ بازار میں سے گزر رہے ہیں یا بس میں سگریٹ منہ میں دبائے

خاموشی سے بیٹھے ہیں تو آپ کے ساتھ بیٹھنے والے کو یہ علم بھی نہ ہو سکے گا کہ آپ دن کا اہم ترین کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اب بتلائیے! کیا آپ پر کوئی ہنسنے کی جرأت کر سکتا ہے۔

مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں کہ آپ سوچنے کے لیے کسی قسم کے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ بس ذہن کو ایک نکتہ پر مرکوز رکھنے کی کوشش میں لگے رہیں۔ کیونکہ کوئی انفرادی مسئلہ نہیں۔ بلکہ مسائل سلجھانے والی قوت اہمیت کی حامل ہے۔ لیکن پھر بھی یہ آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ آپ ایک تیر سے دو شکار مارتے ہوئے کسی مفید مسئلہ پر توجہ مرکوز کریں۔ اس مقصد کے لیے کوئی کتاب اُٹھا لیں۔ اپنے محبوب مصنف کی کوئی تصنیف لے لیں۔ اس کا ایک باب پڑھیں اور پھر اس پر توجہ مرکوز کر دیں۔ لیکن یہ کوئی "ہدایت" نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک تجویز ہے اور میرے نزدیک تو آپ اور مجھ ایسے عام آدمیوں کے لیے روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہی بہت سے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم "بننے" اور دوسروں پر رُعب جھاڑنے کی عادت سے متنفر ہیں۔ لیکن پھر بھی کتاب ایک لحاظ سے بہتر ہوتی ہے وہ اس لیے کہ یہ آپ کی سوچ کے لیے مواد کو باضابطہ اور استدلالی انداز سے پیش کرتی ہے۔ اس لیے شام کو ایک باب کا مطالعہ کرنے کے بعد صبح کو اس پر توجہ مرکوز کیجئے ــــ آپ خود ہی فرق کو محسوس کر لیں گے!

ہاں میرے دوست! میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ مجھ سے چھپانے کی

کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں ٹیلیفون کی طرح آپ کے ذہن کی آواز سُن رہا ہوں۔ آپ خود ہی اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں۔

یہ ساتویں باب تک تو خوب تھا اور اس کی باتیں قدرے دلچسپ تھیں۔ لیکن یہ جو لیسوں میں بیٹھ کر سوچنے اور کسی مسئلہ پر توجہ مرکوز کرنے کو کہتا ہے تو صاحب! یہ اپنے بس کا روگ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے لیے یہ واقعی سود مند ثابت ہو۔ لیکن میں تو سرے سے اس قسم کا انسان ہی نہیں ہوں"

بس یہی تو آپ کی غلطی ہے! یہ آپ ہی کے لیے ہے، جی ہاں! یہ صرف "آپ ہی کے لیے ہے اور میں ایک مرتبہ پھر کہوں گا یہ آپ ہی کے لیے ہے۔ کیونکہ آپ ہی کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ آپ اِس تجویز کو مسترد کر دیں۔ لیکن یاد رکھیے آپ زندگی کی بہتری کے لیے سب سے قیمتی اور انمول تجویز کو مسترد کر رہے ہیں۔

یہ تجویز میری ذاتی اور اپنی نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب سے زیادہ باہوش باعمل اور باہمت لوگوں کی تجویز ہے۔ میں تو آپ کی خدمت میں اسے "سیکنڈ ہینڈ" مال کی طرح سے پیش کر رہا ہوں۔ آپ اپنے ذہن کو اپنے بس میں کر لیں ـــــ اس پارہ کو اپنی مٹھی میں بند کر لیں ـــــ اور آپ خود ہی محسوس کریں گے کہ اس عمل کے دوران ہی میں زندگی کی نصف مشکلات پر آپ حاوی ہو چکے ہیں۔ جن میں سب سے اہم اور نمایاں ترین کا نام ہے ـــــ پریشانی!

پریشانی تارِ عنکبوت کی مانند۔ غیر محسوس کُن انداز سے آپ پر قابو پا لیتی ہے اور دھیرے دھیرے آپ کی صلاحیتوں کو سلب کر کے رکھ دیتی ہے۔ مگر آپ مندرجہ بالا عمل کے دوران ہی اس جال کے طلسم ہوش ربا کو شکست دے کر عروسِ کامرانی سے ہمکنار ہوں گے۔



خودشناسی —— ایک لمحہ فکریہ

ذہن کو کسی نکتہ پر مرکوز کرنا (جس کے لیے ہر روز کم از کم نصف گھنٹہ ضرور وقف کرنا چاہیے) بالکل مبادیات میں سے ہے - یہ ایسے ہے جیسے راگ راگنیوں اور سُرتال سے واقفیت کے لیے "سا۔ رے گا — ما - پا" سے واقفیت لازمی ہے - جب آپ اس سرکش اور منہ زور نا کندہ بچھڑے کو رام کر لیں تو آپ اس قابل ہوں گے کہ اس پر باگیں ڈال کر اس کی رفتار میں اپنی مرضی اور فائدہ کے مطابق کمی بیشی کر سکیں اور آپ کا دماغ جتنا تابع فرمان ہو گا اتنا ہی آپ اُسے اپنی بہبود کے لیے استعمال کر سکیں گے - اس مقصد کے لیے ابتدائی نوعیت کے نکات درج کیے جاتے ہیں - اسے آپ اپنے مطالعہ کے لیے لائحہ عمل قصود کر سکتے ہیں -

اس سلسلہ میں یہ مسئلہ بالکل نہیں پیدا ہوتا کہ مطالعہ کے لیے کس قسم کے لائحہ عمل یا مضامین کی ضرورت ہے - بلکہ یہ مسئلہ تو کبھی پیدا ہوا ہی نہیں - دُنیا میں

ہر دور کے دانش وروں کا اس امر پر اتفاق رہا ہے۔ نہ یہ ادب میں ہے اور نہ ہی سائنس میں —— نہ یہ فن کے کسی شعبہ سے متعلق ہے اور نہ ہی یہ تاریخ سے وابستہ ہے۔ کیونکہ یہ تو انسان کی اپنی ذات اور وجود کا مطالعہ ہے۔ آپ اپنے من کی دنیا میں جھانک کر اپنی رُوح سے تعارف پیدا کرتے ہیں۔ آپ اپنے نفس کی تحلیل کرتے ہیں اور ایک غیر جانبدارانہ انداز سے اپنے آپ کا جائزہ لیتے ہیں —— المختصر یہ ہے —— خود شناسی!

اے غافل انسان خود کو پہچان!

یہ الفاظ اور ان سے وابستہ عالمی صداقت اتنی قدیم ہے کہ مجھے انھیں یہاں تحریر کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ مگر میں پھر بھی انھیں لکھ رہا ہوں۔ کیونکہ یہ تو اس قابل ہیں کہ انھیں سنہری حروف میں لکھا جائے (اور اب مجھے اپنے شرمانے پر شرم آ رہی ہے)

اے غافل انسان! خود کو پہچان!!

—— میں یہ الفاظ پُرزور طریقہ سے ادا کرتا ہوں۔

یہ وہ فقرہ ہے جس سے ہر انسان واقف ہے۔ ہر انسان اس کے مفہوم سے آشنا ہے اور ہر انسان اس کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس پر عمل کرنے والے بہت کم لوگ ملیں گے۔ کیونکہ اس کے لیے جس ارفع دانش، غیر جانبدارانہ انداز اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ایسا کیوں ہے، لیکن میرے خیال میں اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہے —— اور میں اسے کُلی طور سے تسلیم کرتا ہوں۔

کہ دورِ جدید کے عوام میں جس چیز کا عموماً فقدان پایا جاتا ہے وہ ہے — لمحاتِ فکر! آپ عام زندگی کے شعبوں سے متعلقہ کسی قسم کے لوگوں کو ہی کیوں نہ لے لیں — کلرک، ملازمین، اساتذہ، دکاندار، تاجر، آجر — ان سبھی کی زندگی ان لمحات سے ناآشنا ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے ماضی حال کا موازنہ کرتا ہے۔ جب وہ رات کو سوتے وقت دن بھر کے افعال کے حسن و قبح کا محاسبہ کرتا ہے — اور جب وہ مختلف اوقات میں اپنے قول و فعل کے تفاوات پر سوچتا ہے۔

ہم عموماً غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہیں!

اس سے میری یہ مراد ہے کہ ہم ان مسائل پر غور و فکر سے کام نہیں لیتے جن پر ہماری مسرت کا انحصار ہوتا ہے۔ ہم اس ڈگر کے بارہ میں غور و فکر نہیں کرتے جو ہمارے حال کو مستقبل کے دھندلکے سے ملاتی ہے۔ ہم اپنی عام زندگی سے اخذ کردہ نتائج (تلخ یا شیریں) کے بارہ میں بھی غور و فکر سے کام نہیں لیتے نہ ہی ہم اپنے کاموں کے جواز کے لیے منطق اور استدلال کی ضرورت پر غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ہی ہم اپنے افعال و حرکات کو اپنے اصولوں اور نظریات پر منطبق کرنے کی اہمیت اور ضرورت پر غور و فکر کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے باوجود بھی آپ حصولِ مسرت کے لیے کوشاں ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ اور کیا آپ نے مسرت کو (اگر یہ کسی لڑکی کا نام نہ ہو) پالیا ہے؟

لیکن اس ضمن میں آپ کی ناکامی کے امکانات زیادہ قوی ہیں، بلکہ اس کے

امکانات قوی ترین ہیں کہ آپ نے خود کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مسرت ایک خواب ہے — ایک سراب ہے — ! یہ تو سایۂ ہما اور پرِ عنقا ہے —! لیکن ایسے لوگ تھے — اور ہیں — جو حصولِ مسرت میں کامیاب رہے ہیں۔ لیکن یہ وہ لوگ تھے جنہیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ مسرت ان استلذاذی کیفیات سے ماخوذ نہیں ہوتی جو جسمانی تعلقات یا ذہنی موشگافیوں کی بنا پر ظہور پذیر ہوتی ہیں بلکہ حصولِ مسرت کے لیے استدلال کی نشوونما اور قول و فعل اور نظریہ و عمل کی باہمی مطابقت لازمی ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ اسے جھٹلا تو نہیں سکتے ہوں گے۔ لیکن اگر آپ اسے تسلیم کرتے ہیں اور اس کے باوجود بھی آپ اپنے دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ وقت اپنی دانش، اصول اور زندگی کی نہج پر غور و فکر کے لیے نہیں نکالتے ہیں تو آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ آپ زندگی میں جس چیز (یعنی مسرت) کے حصول کے لیے سعی کناں ہیں۔ اسے پانے کے لیے جو فعل ناگزیر اور اساسی اہمیت کا حامل ہے آپ نے اسے ہی فراموش کر رکھا ہے۔

اب کہیے ! میں شرماؤں یا آپ شرماتے ہیں ؟

آپ اس سے بے فکر رہیں میں آپ کی توجہ کے انعطاف کے لیے کوئی خاص قسم کے اصول و قوانین آپ پر ٹھونسنے کی کوشش نہ کروں گا۔ بلکہ اس سلسلہ میں مجھے تو سرے سے آپ کے پسندیدہ اصولوں اور نظریات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے اصول کی رو سے چوری اور نقب زنی دنیا کا معزز ترین پیشہ ہو۔ میرے لیے اس سے کوئی

فرق نہیں پڑتا (خواہ آپ یہ کتاب چرا کر ہی کیوں نہ پڑھ رہے ہوں) میرے کہنے کا تو صرف یہ مقصد ہے کہ زندگی کا وہ کاروان جو اپنے نظریات اور اصولوں کی روشنی میں گامزن نہیں ہوتا ہے۔ وہ بے فائدہ اور بے سود ہے ۔۔۔ وہ فعل جو قول سے مطابقت نہیں رکھتا ہے سراسر احمقانہ ہے اور جہالت پہ مبنی ہوتا ہے۔ اس مقصد کو پانے کے لیے آپ کو اپنی روزمرّہ کی زندگی کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس کی چھان پھٹک کرنی ہوگی اور اس کے بعد بعض افعال کے بارہ میں کچھ عہد کرنے ہوں گے ایک چور اور سارق مستقل طور سے کیوں پریشانی کے بھنور میں گھرا ہوا خوف کے سایہ تلے زندگی بسر کرتا ہے ۔۔۔؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کے نظریات اور افعال (جسے آپ پیشہ بھی کہہ سکتے ہیں) میں بُعد ہوتا ہے۔ وہ چوری کرتا ہے۔ مگر (دل کی چوری کے سوا) وہ ہر چوری کو بُرا سمجھتا ہے۔ اگر وہ ذاتی طور سے چوری کو اخلاقی لحاظ سے ایک مستحسن فعل تصوّر کرتا تو قید خانہ اس کے لیے تفریح گاہ بن جاتا اور سزا کی میعاد خوشبوں کی گھڑیوں کی مانند پل بھر میں بیت جاتی۔ بھگوڑے سپاہیوں کے مقابلہ میں شہدا ہمیشہ خوش ہوتے ہیں۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عقائد کی سچائی میں یقین رکھتے ہیں اور ان ہی کی خاطر وہ جان قربان کر دیتے۔ اسی وجہ سے ایک محبِ وطن مسکراتا ہوا تختہ دار پہ لٹک جاتا ہے کہ اسے اپنی جان سے زیادہ اپنا نظریہ (آزادیٔ وطن) عزیز ہوتا ہے، قول وفعل میں ہم آہنگی کی نذدیں تریں مثال شہدائے کربلا کی صورت میں ملتی ہے۔

جہاں تک منطق اور استدلال (ہماری عام زندگی کا طرزِ عمل اسی سے

ماخوذ ہے اور اصول و نظریات بھی ایک حد تک اسی سے عبارت ہوتے ہیں) کا تعلق ہے تو عام نظریہ کے برعکس یہ ہماری زندگیوں کی ساخت اور ترتیب میں اتنا اہم کردار نہیں ادا کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہم ہر موقع پر منطق و استدلال سے کام لیں اور اپنے انداز و اطوار کو ان ہی کی روشنی میں وضع کریں مگر عموماً ایسا ہوتا نہیں اور ہم وقتی جذبہ، من کی موج اور ہیجانی اشتعال کے زیر اثر منطق و استدلال کے برعکس کام کر جاتے ہیں۔ ہم جتنا ہی کم غور و فکر سے کام لیں گے ہماری زندگی منطق و استدلال کی راہنمائی سے اتنی ہی دور ہوتی جائے گی۔ اس لیے اگر اس مرتبہ آپ ہوٹل کے بیرے سے اس وجہ سے اُلجھنے کے خواہاں ہوں کہ چائے کا دودھ ٹھنڈا ہے تو آپ ان دونوں کو اپنے ذہن کے ایک گوشہ میں طلب کر لیں اور پھر ان کے مشورہ پر عمل پیرا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ آپ پر واضح کر دیں گے کہ بیرے کا کام چیزیں لا کر میز پر رکھنا ہے۔ ٹھنڈے اور گرم دودھ سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ معاملہ تو مطبخ اور باورچی کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن فرض کریں اگر اس میں بیرے کا قصور بھی نکل آتا ہے تو اس صورت میں بھی آپ اس سے اُلجھ کر کچھ نہیں حاصل کرتے۔ بلکہ اُلٹا آپ کی شان گھٹے گی ـــ دوسرے معقول لوگ آپ کو چغد سمجھیں گے ـــ اِدھر اپنے دل میں بیرا آپ کو بُرا بھلا کہے گا (بلکہ بعض تو وہاں سُنا دیا کرتے ہیں) ـــــ اور اس تمام لڑائی جھگڑے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دودھ کے ساتھ ساتھ چائے کا پانی بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اب یا تو اسے دوبارہ گرم کرا کر اس کے خوش گوار

فلیور کا بیڑا غرق کریں، اور یا پھر مزید گرم ہو کر سرد چائے زہر مار کریں۔
اس مشورہ کا (جس کے لیے کسی قسم کی کوئی فیس نہیں وصول کی جاتی ہے) یہ نتیجہ ہوگا کہ اگر دوبارہ دودھ ٹھنڈا آئے گا تو آپ خود گرم ہونے کی بجائے بیرے کو بلا کر اس سے انسانوں کی طرح اور ملائمت سے بات کریں گے۔ آپ اسے بتائیں گے کہ یہ ٹھنڈا دودھ ہے جو چائے کا بیڑا غرق کر دے گا ــــ وہ آپ کو دودھ گرم کرا کر لا دے گا۔ آپ کا کام بھی ہو گیا، بیرہ کو کوفت بھی نہ ہوئی اور آپ جنگ ہنسائی سے تو نہیں البتہ "ہوٹل ہنسائی" سے بھی بچ گئے۔

اگر آپ اپنے بعض اصولوں میں ترمیم و تنسیخ کے خواہاں ہوں یا آدابِ زلیست کے لیے نئے ضابطہ وضع کرنے کے متمنی ہوں تو آپ کے لیے ایسی کتابیں بہت مفید اور ممد ثابت ہو سکتی ہیں۔ جو ان ہی موضوعات سے بحث کرتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں ایسی کتابوں کے سستے ایڈیشن طبع کیے جاتے ہیں تاکہ عوام ان سے متمتع ہو سکیں۔ ہمارے ہاں بھی اس مقصد کے لیے بعض اچھے تراجم مل جاتے ہیں۔ ان سے خوب فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میں خود بھی ایسی کتابوں کا شیدائی ہوں اور میں سفر پر جاتے وقت، ایسی کتابیں ضرور ساتھ لے لیتا ہوں ــــ جی ہاں! کتابیں واقعی لاتحدود اہمیت کی مالک ہوتی ہیں۔ مگر صرف کتابوں کے مطالعہ سے ہی آپ سب کچھ نہیں حاصل کر سکتے اور ان سے مستزاد اہمیت کا حامل روزمرہ کا وہ تجزیہ ہوتا ہے جو دیانتداری اور غیر جانبداری پر مبنی ہو۔ آپ کو چاہیئے کہ حالیہ افعال کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ

مستقبل کے مجوزہ افعال کا بھی محاسبہ کرتے رہیں۔ آپ کو ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی ذات کا (خواہ نقوش مسخ ہی کیوں نہ نظر آئیں) جائزہ لیتے رہنا چاہیئے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے کون سا وقت موزوں ترین ہو سکتا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ شام کو گھر واپس آنے والا وقت موزوں ترین ہے۔ ویسے بھی جب انسان تمام دن کی محنت سے فارغ ہو تو وہ فطری طور سے بھی لمحات فکر میں کھو جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس بات کو تسلیم نہ کریں اور اساسی فریضہ کی بجا آوری پر اخبار بینی (ویسے آپ اسے رات کے کھانے تک ملتوی کر سکتے ہیں) کو ترجیح دینا پسند کرتے ہیں — تو صاحب! ایسی صورت میں مجھے آپ سے مزید کچھ نہیں کہنا — اور اس کے لیے دن کے لائحہ عمل میں سے کوئی وقت نکالا جا سکتا ہے۔

— اور اب میں شام کی طرف آتا ہوں!

فنونِ لطیفہ سے دلچسپی

ایسے لوگ کثیر تعداد میں مل سکتے ہیں جو اپنی شاموں کو محض اسی وجہ سے آرام کرسی پر پڑے پڑے گزار دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک اگر وقت کٹی کے لیے انسان بے کار پڑا اینڈتا رہے تو دوسری صورت میں اسے ادب سے رجوع کرنا پڑتا ہے اور کیونکہ وہ ادبی ذوق نہیں رکھتے اس لیے وہ تمام شام اِدھر اُدھر تو یں ہی ضائع کر دیتے ہیں۔ مگر یہ عام خیالی ہے۔ البتہ اتنا ہے کہ کسی چیز سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے یا عام معلومات کے حصول کی غرض سے اگر کتابوں سے دامن چھڑانا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔

اگر آپ پُلوں کی ساخت، یا کشتی رانی کے بارہ میں معلومات کے خواہاں ہیں تو میرا خیال ہے کہ ایسی صورت میں آپ محض ادبی ذوق کے فقدان کی بنا پر اچھی کتابوں سے استفادہ حاصل کرنے میں ناکام نہیں رہ سکتے ہیں، کیونکہ

پلوں کی ساخت اور کشتی رانی پر آپ کو بہترین کتابیں مل سکتی ہیں۔ دراصل یہ غلط فہمی اس بنا پر ہے کہ لوگ ادب اور غیر ادبی (یعنی فنی اور سائنسی) موضوعات کو آپس میں خلط ملط کر دیتے ہیں حالانکہ کشتی کی سیر پر کسی کی نظم اور اس کے متعلق فنی قسم کی ٹھوس باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔ میں ادب کا بعد میں جائزہ لوں گا۔

آیئے! اب ہم ایسے افراد کا جائزہ لیں جنھوں نے غالب کا مطالعہ نہیں کیا اور جنھیں اس بحث سے کوئی سروکار نہیں کہ انیس اچھا مرثیہ گو شاعر تھا کہ دبیر ــــ اگر آپ کو ایسے لوگ ملتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں! کیونکہ ادب کا دلدادہ نہ ہونا کوئی جرم نہیں اور نہ ہی یہ ان کی کند ذہنی اور غبی پن کی دلیل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دلدادگان ادب کے خیال میں ایسے تمام لوگ واجب گردن زدنی ٹھہریں جو بطورِ مثال اقبالؔ کے کلام پر رومیؔ کے اثرات کو نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن سوچ کا یہ انداز دانش مندی پر مبنی نہیں ہے۔ اب آپ ہی سوچیے کیا کبھی زندگی کے ایک جزو کو "کل" پر محیط کرنے کی سعی بار آور ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں! اب اگر ادب کے پرستاروں سے یہ سوال کیا جائے کہ انسانی جسم میں کتنی وریدیں اور شریانیں ہیں ــــ یا سیم اور تھور کے لیے کون کون سی انسدادی تدابیر وضع کی جا سکتی ہیں ــــ اب ظاہر ہے کہ طب اور معاشیات کے مسئلہ سے ادب کا طالب علم کیا دلچسپی رکھ سکتا ہے یہی حال زندگی سے وابستہ دیگر علوم و فنون کے مقابلہ میں ادب کا ہے۔ تمام زندگی ادب سے ہی عبارت نہیں ہے بلکہ ادب سے ماورا ہو کر

جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ ذہن کے تعمیر کردہ صنم خانوں کے لیے عقل و دانش نے صدہا اصنام تراشے ہیں۔ میں عام زندگی سے مثال لیتا ہوں۔ آپ ریڈیو کے پاس کرسی پر نیم دراز ہیں۔ فضا فلمی نغموں سے معمور ہے۔ سگرٹ آپ کی انگلیوں میں جل رہا ہے اور آپ نے خیالات کا ایک جہان آباد کر رکھا۔ آپ کو معمولی سا شور بھی ناگوار ہے۔ فرمائشی پروگرام ختم ہو جاتا ہے۔ آپ کے لبوں پر تبسم کی کرنیں رقصاں ہیں۔ آپ خود کو پہلے سے کہیں زیادہ ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کرتے ہیں —— اور اس پر بھی آپ کو یہ گلہ ہوتا ہے کہ میں موسیقی کے ذوق سے عاری ہوں۔ (شاید اس وجہ سے کہ آپ کلاسیکل موسیقی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے ہیں) میں کوئی ساز نہیں بجا سکتا —— ستار میری انگلیوں کے بھونڈے انداز سے لرز جاتا ہے —— مضراب میرے چھونے سے ہی کپکپا جاتی ہے اور میرے لمس سے ہی پردہ ساز احتجاجی انداز سے چیخ اٹھتا ہے۔ حتیٰ کہ بانسری ایسی چیز بھی میرے دم سے بے دم ہو جاتی ہے —— لیکن اگر آپ کوئی ساز نہیں بجا سکتے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر آپ کلاسیکی راگ راگنیوں کو اپنے لیے سامع نواز نہیں پاتے تو کوئی مضائقہ نہیں —— ہر چیز ہر انسان کے لیے نہیں ہوتی ہے۔ آپ فلمی گانوں سے محظوظ ہو لیتے ہیں۔ بس یہی کافی ہے آخر وہ بھی تو کسی راگ راگنی ہی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

اس لیے اگر آپ ستار یا وائلن نہیں بجا سکتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ایک سازینہ کی تشکیل کرنے والے مختلف النوع سازوں کی ابتدا ہی کی

ساخت اور اسی قسم کی دیگر باتیں جاننے کے لیے بھی کوشش نہ کریں۔ اب تک تو آپ سازینہ کو صرف مختلف قسم کے سازوں پر مشتمل سمجھتے ہیں۔ جس میں تمام ساز "اپنی اپنی بولیاں" بولتے ہیں اور آپ کے لیے یا تو ان کا مجموعی تاثر خوشگوار ہوتا ہے اور یا ناخوشگوار ـــــ آپ نے اس ضمن میں جزئیات کی تفصیلات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیونکہ آپ نے کبھی اتنی تکلیف ہی نہیں گوارا کی کہ فرحت بخش ثابت ہونے والی چیزوں کے بارہ میں بھی کچھ جانا چاہئے۔

اگر کوئی آپ کے پسندیدہ نغمہ کے بارہ میں استفسار کر بیٹھے تو آپ کئی گیتوں کے نام گنوا سکتے ہیں۔ لیکن آپ ان میں سے کسی ایک کے بارہ میں بھی یہ نہ بتا سکیں گے کہ اس کے سازینہ نے کن کن سازوں سے ترتیب پائی ہے ـــــ اور اس کے باوجود وہ گیت آپ کا پسندیدہ ہے۔ اس سے آپ کے تمام جسم میں ایک برقی لہر دوڑ گئی تھی۔ اور آپ ہر مرتبہ اسے سن کر کچھ ایسے ہی احساسات سے دوچار ہوں گے۔ بلکہ آپ کو یہ اتنا پسند آیا ہے کہ آپ نے خاص طور سے اپنی محبوبہ سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اگر اس کے بارہ میں آپ کی معلومات کی تمام پونجی کا جائزہ لیا جائے تو آپ صرف اتنا ہی جانتے ہیں ـــــ یہ دھن نوشاد نے مرتب کی تھی اور یہ گانا بڑا مزے دار ہے ـــــ بس! اس کے آگے صفر!

لیکن اگر آپ موسیقی اور سازوں کے بارہ میں کوئی معلومات افزا کتاب پڑھنے کی تکلیف گوارا کریں اور اس میں دی گئی تصاویر سے مختلف سازوں کی

اشکال بھی اپنے ذہن میں بٹھالیں تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ دوبارہ اپنا پسندیدہ گیت سنتے ہی آپ مختلف سازوں کو پہچان جائیں گے ـــــ یہ پیانو ہے، یہ اکارڈین اور یہ تو الیکٹرک گٹار ہے! اس سے آپ کی دلچسپی میں بے انتہا اضافہ ہوجائیگا اور کچھ عرصہ بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ کا ذوقِ سماعت ارتقا کی طرف مائل ہے۔ اب آپ کو احساس ہوگا کہ مختلف النوع سازوں کی آوازوں کی ترتیب، ان کے خاموشی کے وقفے اور پھر سب کی آوازوں کی یک آہنگی سے کیسے ایک مخصوص تاثر کو جنم دیا جاتا ہے۔ سازوں سے واقفیت کی بنا پر جب آپ کسی جداگانہ آواز کو پہچانیں گے تو آپ کو ایک خاص قسم کی فرحت حاصل ہوگی۔ اس طرح آپ سرود، ستار، وچتر وینا اور تان پورہ ـــــ سب کی آوازوں اور ان کے زیر و بم کی لطافت اور گہرائی میں تمیز کرنے کے قابل ہو جائیں گے ـــــ اور کل کو اگر اس موضوع پر آپ کے احباب میں بات چلی تو آپ انہیں یہ سمجھا سکیں گے کہ ایک طبلچی وائلن والے سے کیوں زیادہ پیسے لیتا ہے۔ حالانکہ وائلن نسبتاً زیادہ مشکل ساز ہے۔ اب تک موسیقی آپ کے لیے ایک خارجی شے تھی۔ مگر اب وہ ایک داخلی چیز بن جائے گی۔ پہلے آپ اس بچہ کی مانند ہوتے تھے جو بہت چمکیلی شے کے سامنے آنکھیں بند کرکے بیٹھ رہتا ہے۔ مگر اب حالت اور ہوگی اور آپ سازوں کے زیر و بم اور صوتی تاثر کے ساتھ ساتھ اپنے احساسات کے تموج کو بھی شامل کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

اگر آپ موسیقی سے دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ کو حصولِ معلومات کے لیے

ایک خاص لائحہ عمل مرتب کر کے اس کے مطابق چلنا ہوگا۔ آپ موسیقی کے کسی شعبہ سازوں کے کسی خاص گروہ یا کسی خاص موسیقار کو لے لیں اور جب ایک ہفتہ میں تین شاموں پر مشتمل سال کا اختتام ہوگا تو آپ خود ہی یہ محسوس کریں گے کہ آپ موسیقی کے بارہ میں بہت کچھ جان چکے ہیں اور ابھی مزید جاننے کی تمنا ایک قندیل کی طرح فروزاں ہوگی۔

لیکن آپ تو چلا اٹھے ہیں :

" مجھے موسیقی سے نفرت ہے !"

تو جنابِ من! اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ موسیقی تو میں نے بطور مثال پیش کی تھی۔ یہ طریقِ کار موسیقی کے لیئے سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ وہی دیگر فنون یا فنونِ لطیفہ پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے۔ بس آپ اس کے لیئے ایک لائحہ عمل مرتب کر لیں لاہور ایسا شہر صدہا طریقوں سے آپ کی امداد کر سکتا ہے۔

لیکن یہ کیا۔ ۔ ۔ ؟

آپ تو پھر چیخ اٹھے :

" مجھے ہر طرح کے فنونِ لطیفہ سے کد ہے "

حضورِ والا!

اِس سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ اس لیئے آیئے! ادب کا جائزہ لینے سے پیشتر ہم آپ ہی سے کیوں نہ نپٹ لیں ؟

علت و معلول کی آنکھ مچولی

یہ ٹھیک ہے کہ فن دُنیا کی عظیم ترچیز ہے۔ مگر اسے ہم عظیم ترین نہیں قرار دے سکتے ہیں۔ ادراک کی تمام اقسام میں سے علت و معلول کا مسلسل ادراک اہم ترین حیثیت کا حامل ہے، بہ الفاظِ دیگر کائنات کی مسلسل ارتقاء پذیری کا ادراک یا زیادہ سیدھے سادے الفاظ میں ـــــ خود عمل ارتقاء کا ادراک!

جب ایک انسان اس اہم ترین حقیقت کو ذہن نشین کر لیتا ہے کہ ہر وقوعہ کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی وجہ کارفرما ہوتی ہے اور یہ علت ہی ہے جس کی اساس پر معلول کی رفیع الشان عمارت استوار ہوتی ہے تو اس احساس کی بنا پر صرف کشادہ ذہنی ہی نہیں بلکہ عالی ظرفی بھی پیدا ہوتی ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ گھڑی کے چرائے جانے سے کوئی بھی خوش نہیں ہوتا لیکن انسان اتنا ضرور سوچتا ہے کہ گھڑی چرانے والے فرد کو چوری پر مائل کرنے والے کئی عناصر تھے۔ ان تمام عناصر کو مجموعی لحاظ سے نسلی وراثت

اور ماحول میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ فرد کی شخصیت کے تعین اور اس کے ارتقا میں نسلی وراثت اور ماحول کے تانے بانے کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہوتا ہے۔ یہ سب سوچنے کے بعد جب وہ دوسری گھڑی خریدے گا تو اس کی قیمت ادا کرتے وقت وہ خوش تو نہ ہو گا۔ لیکن کم از کم اس تمام واقعہ کو وہ فلسفیانہ رنگ دینے میں کامیاب ہو جائے گا جس کی بنا پر گھڑی خریدتے وقت اس کا دل تلخی سے پاک ہو گا۔ علت و معلول کی آنکھ مچولی کے مطالعہ کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ انسان اس صدمہ، دہشت اور تجربے سے ایک حد تک چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ جو زندگی کے حادثات و واقعات کے ضمن میں پیش آتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ خود انسان ہوتے ہوئے اور انسانوں میں رہتے ہوئے بھی انسانی فطرت کو ایسے سمجھتے ہیں جیسے وہ کوئی ہوا ہے یا وہ کوئی ان جان ملک ہے جہاں کے رسوم و روایات ان کے لیے اجنبی ہیں۔ لیکن ذہنی بلوغت اور پختگی کے بعد انسان کو اپنے اس رویہ پر خود ہی شرم آنی چاہیئے کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں اجنبی بنا پھرتا ہے۔ علت و معلول کے مطالعہ سے جہاں تلخابۂ زیست میں ایک حد تک کمی پیدا ہو جائے گی وہاں زندگی کی گہما گہمی میں بھی گوناں گوں انداز سے اضافہ ہو جائے گا۔

وہ انسان جس کے لیے "ارتقا" مفہوم و معانی سے عاری محض ایک پنج حرفی لفظ ہے۔ وہ جب کراچی جانے کے بعد کلفٹن جاتا ہے تو اس کے لیے سمندر محض پانی کا ایک وسیع ترین قطعہ ہے جس کی کف آلود موجیں ساحل سے دیوانہ وار سر ٹپکتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ انسان جسے ارتقا سے دلچسپی ہے جو

علت و معلول کے مسلسل کھیل کو سمجھتا ہے۔ وہ جب علم طبقات الارض کی آنکھ سے سمندر کا نظارہ کرتا ہے تو اسے احساس ہو جاتا ہے کہ یہ پرسوں گیسوں کا مجموعہ تھا ——— کل یہ کھولتے ہوئے مائعات سے بھرا تھا اور گو آج اس کی سرکش موجوں کا نظارہ دلکش ہے مگر کل اسے لازمی طور سے منجمد ہونا ہے۔

اسے احساس ہو جاتا ہے کہ آج جسے ہم مائع کے روپ میں دیکھتے رہے ہیں یہی کل کو مراحلِ ارتقا سے طے کرنے کے بعد ایک ٹھوس اور جامد شئے کا روپ دھار لے گی۔ یوں اسے زندگی کی عظمتوں اور کائنات کی گمبھیرتا کا احساس ہوتا ہے اور یوں وہ زندگی کے متنوع مرقعات سے لطف اندوزی حاصل کرتا ہے۔ اگر آپ اسے سمجھ کر مستقل طور سے سراہ سکتے ہیں تو آپ کی طمانیت پائیدار ہو گی اور آپ کا سکون انمٹ ہو گا ——— اور یہی تمام علوم کا منتہائے مقصود ہے!

علت و معلول کی آنکھ مچولی ہر جگہ اور ہر وقت جاری رہتی ہے۔ کوریا میں جنگ چھڑتی ہے مگر اس سے آپ کے یہاں مہنگائی بڑھ جاتی ہے۔ گندم کی سمگلنگ ہوتی ہے اور کپڑے کا بھاؤ بڑھ جاتا ہے۔ بیرونی ممالک ترقیاتی منصوبوں کے لیے امداد دیتے ہیں اور افراطِ زر آپ کی جیب سے زبردستی "زکوٰۃ" نکلوا لیتی ہے ——— بظاہر ان عوامل کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا مگر ایک معاشیات کا طالب علم تجزیہ کر کے آپ پر یہ سب کچھ واضح کر سکتا ہے۔

"یہ تو بالکل آسان اور واضح ہے" آپ کہہ اٹھتے ہیں۔

جی ہاں! سب کچھ آسان اور سہل ہو جاتا ہے۔ یہ کائنات اور اس کے

اُلجھے ہوئے اسرار ــــ ایسے ہی آسان ہیں جیسے دو جمع دو چار ہوتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ دو جمع دو چار کرنا جانتے ہوں۔ لیکن کیا کیا جائے ــــ آپ تو ایک فرم میں کلرک ہیں۔ آپ کا اوڑھنا بچھونا تو اعداد امداد کی جمع تفریق ہے۔ آپ کو تو فنون لطیفہ سے ویسے ہی چڑ ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ اپنی لافانی رُوح کو ارفع ترین روحانی سربلندیوں اور وجدان کی اعلیٰ ترین سرخوشیوں سے روشناس کرانا چاہتے ہیں ــــ اور اس لیے آپ کو اپنے کام سے دلچسپی نہیں۔ آپ اپنی زندگی کی یک رنگی سے تنگ ہیں اور آپ اس سے بور رہتے ہیں۔

لیکن اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس پر آپ بے ہنگام اور بور کا لیبل چپکا سکیں۔

آپ کی فرم مکانات اور جائیداد کی خرید وفروخت کا کام کرتی ہے۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ زندگی کی عظیم ہلچل آپ کی فرم کی فائلوں میں کس انداز سے منعکس ہوتی ہے۔ کراچی میں جب صدر کے بعض حصوں میں ٹریفک کی زیادتی کی بنا پر آمدورفت میں دقتیں پڑنے لگیں اور ٹریفک کو رواں دواں رکھنے میں گڑبڑ پیدا ہونے لگی تو سڑک کے نیچے زمین دوز راستے بنا دیئے گئے۔ نتیجہ ــــ اس علاقہ میں جائیدادوں کے بھاؤ اور بھی چڑھ گئے ــــ اب آپ اس مسئلہ کی روشنی میں لاہور کی مال روڈ پر ٹریفک کی زیادتی سے پیدا شدہ نتائج کے بارہ میں مزید معلومات اخذ کریں اور پھر اسے لاہور کے حالات پر منطبق کریں تو کیا یہ دلچسپ نہ ہوگا ؟ اگر آپ اس کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ

وقف کر دیں تو کیا اس سے آپ کی دفتری استعداد پہ اثر نہ پڑے گا۔ کیا اس سے آپ اپنے ساتھیوں میں ممتاز نہ ہو جائیں گے ــــ ہو سکتا ہے کسی دن اس کی بنا پہ آپ کو ترقی مل جائے ــــ اور کیا اس سے آپ کی زندگی کا انداز تبدیل نہ ہو جائے گا

جیسے جیسے آپ کے مطالعہ میں اضافہ ہوتا جائے گا ویسے ویسے ہی آپ نت نئے مسائل اور سوالات سے دوچار ہوتے جائیں گے۔ اور اس سے آپ کو جو نئی نئی باتیں معلوم ہوں گی وہ آپ کے لیے حیران کن ثابت ہوں گی۔ آپ لاہور میں بیٹھے بیٹھے یہ جان جائیں گے کہ لندن کی سب سے طویل گلی کی چوڑائی ڈیڑھ گز کیوں ہے اور پیرس کی طویل ترین شاہراہ میلوں تک چلی گئی ہے ــــ اور ہو سکتا ہے کہ اس سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل ہڑپہ اور موہنجوڈارو کے لوگ بالکل سیدھی گلیاں بناتے تھے جو پورا لمبے پر ایک دوسرے کو ۹۰ کے زاویہ پہ کاٹتی تھیں۔

میرے خیال میں اب آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں نے جائیداد وں کا کام کرنے والی فرم کے کلرک کا چناؤ کرنے کی صورت میں کسی ایسے فرد کو نہیں لیا جو خصوصیت سے میرے نظریات کی وضاحت کر سکتا ہو۔

چلئے آپ ایک بینک کے کلرک ہیں۔ آپ تمام دن کاؤنٹر پر کام میں مصروف رہتے ہیں اور جب تک تمام ان کا حساب کتاب ٹھیک نہ ہو جائے آپ بینک چھوڑ کر نہیں جا سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اس کو انسانی فطرت سمجھنے کا

ایک ذریعہ بنالیں اور اس مقصد کے پیشِ نظر ہفتہ میں تین شاموں کے نوّے منٹ وقف کر دیں تو آپ کو یہ زندگی خوش گوار نظر آئے گی اور اس سے وابستہ زندگی کے کئی ایسے پہلو آپ کے سامنے آجائیں گے جو اب تک آپ کی نگاہوں سے روپوش رہے تھے۔

علاوہ ازیں آپ سیر تفریح کے لیے بھی جا سکتے ہیں۔ گو آپ دن بھر ایک کامیاب بینک کے شور و غل والے ماحول میں رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی آپ اتوار کو پک نک کے لیے جا سکتے ہیں۔ آپ گاؤں کی سیر کو جا سکتے ہیں اور اس سے آپ نت نئے اور متنوع تجربات و مشاہدات اخذ کریں گے۔ آپ شام کو اپنی گلی میں لگے ہوئے لیمپ کے پاس جا کھڑے ہوں اور وہاں جو طرح طرح کے پتنگے آتے ہیں انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے بارہ میں حصولِ معلومات سے آپ ایک ایسے موضوع پر گفتگو کرنے کے اہل ہو جائیں گے۔ جس پر عموماً لوگوں کی معلومات بہت کم ہوتی ہیں۔

تو میرے دوست سمجھ گئے۔ زندگی میں سرگرمی پیدا کرنے کے لیے ادب یا فنونِ لطیفہ کی طرف رجوع کرنا ضروری اور لازمی نہیں ہے۔

آپ کے سامنے زیست کا خوانِ نعمت آراستہ ہے۔ آپ جس چیز پر چاہیں اپنی توجہ صرف کر سکتے ہیں۔ قدرت کے نظارے اور فطرت کے مناظر آپ کے مدد رد ہیں۔ آپ ان سے دلچسپی کا اظہار کریں یہی زندگی ہے ـــــ اس طرح سے حاصل کردہ تسکین اپنے قلب کو سمجھنے کے مترادف ہے۔

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر آپ کو ادب سے شغف نہیں یا فنونِ لطیفہ کا مذاق نہیں تو میں آپ کے معاملہ کو سلجھاؤں گا۔ اور میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ اب میں ان حضرات کی طرف آتا ہوں جن کی بے حد اکثریت ہے اور جو "مطالعہ کے شوقین" ہیں۔

سنجیدہ مطالعہ

کیونکہ ناول اور افسانے "سنجیدہ مضامین" میں نہیں گنے جاتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی صاحب ذہنی کشادگی کے لیے ہفتہ کی تین شاموں کے دو سو ستر (۲۷۰) منٹوں کو گزارنے کے لیے افسانوں یا جاسوسی ناولوں کا ایک ڈھیر لگا کر بیٹھنے کا ارادہ کر رہے ہوں تو میری ان سے یہی گزارش ہو گی کہ وہ اپنے اس منصوبہ کو تبدیل کر دیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ ناول یا افسانے بذاتِ خود "غیر سنجیدہ" ہیں۔ کیونکہ دنیا کے عظیم ادب کا ایک حصّہ ناول اور افسانوں پر مشتمل ہے۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ خراب ناول اور فضول قسم کے افسانے پڑھنا محض تضیعِ اوقات ہے۔ جبکہ اچھا ناول یا افسانہ ایسی چیز نہیں جس کے لیے قاری کو خاص طور پر وقت مخصوص کر کے اور دماغ کو حاضر کرنے یا موڈ بنانے کی ضرورت ہو، یہ تو ایک دوسری قسم کا ناول ہے جو چیونٹی کی چال چلتا ہے اور ایک اچھا ناول پڑھتے وقت آپ کو کبھی بھی وقت کے گزرنے کا احساس نہ

ہوگا۔ یہ خصوصیت سے اچھے جاسوسی ناولوں کے بارہ میں زیادہ صحیح ہے۔ یہ ایسے ہوتے ہیں جیسے آپ ایک چھوٹی سی کشتی پہ تیز رفتار ندی کے دھارے پہ بہے چلے جا رہے ہیں اور اختتام کے وقت آپ کا سانس ایسے ہی تیز تیز چل رہا ہوتا ہے گویا آپ واقعی اس تیز رفتار کشتی پہ سفر کرتے آ رہے ہوں۔ ایک اچھا ناول کبھی بھی آپ کے ذہن پہ بار نہ بنے گا۔ جب کہ اس کے برعکس ذہنی وُسعت اور ترقی کے لیے "بار" کا یہ احساس ایک ناگزیر عنصر ہوتا ہے۔ یہ بار بعض اوقات کام کی مشکل نوعیت کا پیدا کردہ ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ اس نفسیاتی کشمکش کا جنم دہندہ ہوتا ہے۔ جب آپ کی ذات دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے ایک حصّہ اس کام کو کرنے کا متمنّی ہوتا ہے اور دوسرا اس سے گریزاں ـــــ لیکن ناول یا افسانہ کے مطالعہ کے سلسلہ میں آپ کی ذات کبھی بھی یوں دو حصّوں میں نہیں بٹتی ہے۔ امراؤ جان ادا کا مُطالعہ کرنے کے لیے آپ کو کسی قسم کے ارادہ اور عزم کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اِس لیے آپ ناول اور افسانے ضرور پڑھیں۔ مگر آپ انہیں ان نوٹس سے منٹوں میں نہ پڑھیں۔

جہاں تک ذہنی کیفیات میں تموّج پیدا کرنے کا تعلق ہے، تو ادب میں "تخیلاتی شاعری" سے بڑھ کر اور کوئی صنف نہیں ہے اور اپنے تاثرات کے اعتبار سے یہ ناول افسانے سے کہیں بڑھ کر ہے بلکہ تمام ادب کی بوقلمونیاں ایک طرف اور "تخیلاتی شاعری" کی اثر آفرینی ایک طرف! یہ ادب کی اعلیٰ صنف ہے۔ اس کی پیدا کردہ استلذاذی کیفیات اعلیٰ تر ہوتی ہیں اور اس کے معانی میں پوشیدہ دانش بہ اعتبارِ نوعیت اعلیٰ ترین ہوتی ہے۔ المختصر! اس کا

مقابلہ کسی سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ لاثانی اور لاجواب ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اس المناک حقیقت کا احساس ہے کہ لوگوں کی اکثریت شاعری کا مطالعہ نہیں کرتی۔

مجھے یقین ہے کہ بہت سے ایسے لوگ (ایسے لوگ جو خود کو بہت کچھ سمجھتے ہیں) مل جائیں گے۔ جن کے سامنے ــــ انارکلی کی سیر یا دیوان غالب کا مطالعہ ــــ یہ دو متبادل تجویزیں پیش کی جائیں تو وہ بلا تکلف انارکلی کی سیر کو ترجیح دیں گے اور امریکن کا ڈبوائے ایسی چیکدار ٹی شرٹ اور ریڈی میڈ بوائے والی جین پہن کر اپنی دانست میں "ہیرو" بنے۔ وہ لقہ کبوتر کی طرح گردن اکڑائے اور چھاتی پھیلائے بے مقصد آوارہ گردی کرنے میں بہت خوشی محسوس کریں گے۔ لیکن اس کے باوجود میں دوست دشمن ہر ایک کو تمام اصناف ادب سے پہلے شاعری کی طرف رجوع کرنے کو کہوں گا۔

اگر آپ کے لیے شاعری کا پڑھنا اور سمجھنا وبال جان بن جاتا ہے اور آپ کوشش کے باوجود بھی الفاظ کے آہنگ میں پوشیدہ نازک مفہوم کو نہیں سمجھ پاتے ہیں۔ اگر آپ کا ذہن تشبیہات اور استعارات کی پیدا کردہ تاثراتی کیفیات سے نابلد رہتا ہے تو آپ کسی اچھے سے نقاد کے مقالات کا مطالعہ کریں۔ ایسے مقالات جو شاعری اور اس کے دیگر پہلوؤں سے بحث کرتے ہوں ان سے آپ کو علم ہو جائے گا کہ شاعری دیوانگی نہیں بلکہ جزو پیغمبری ہے اور یوں آپ میر کی کیفیات حسن و عشق سے لے کر اقبال کے الہامی پیغامات تک سب کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر

آپ نے پہلے شاعری کو سمجھ کر اس کے بعد شاعری کا مطالعہ کیا تو آپ میں نہ صرف اس کا صحیح مذاق ہی پیدا ہوگا۔ بلکہ یہ آپ کے لیے ایک طرح کا نشہ بن جائے گی۔

اگر آپ کسی طرح سے بھی ادبی مقالات کی "خشکی" کو برداشت نہیں کر سکتے تو پھر میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ مثنویوں سے آغاز کریں۔ اس سے آپ کو کئی طرح کی سہولتیں رہیں گی۔ زبان نسبتاً آسان ہونے کے علاوہ پلاٹ اور کرداروں کی بنا پر آپ کی توجہ اس پر مرکوز رہے گی۔ گو ہمارے ہاں اچھی مثنویاں کم ہیں لیکن پھر بھی آپ کو "راہ پر لگانے" کے لیے کئی مثنویاں (جو اُردو اُدب میں لازوال شہرت کی مالک ہیں) مل جائیں گی۔

اُردو اُدب میں ایک بہت اچھا "ناول" موجود ہے۔ اس میں کردار نگاری منظر کشی، حُسن کی دلکش اَدائیں اور عشق کی مجبوریاں ــــ رقابت اور سچی دوستی کی وفاکشی ــــ یہ سبھی موجود ہے۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ یہ "ناول" نثر کی بجائے منظوم صورت میں ملتا ہے۔ اِس کے مصنّف میر حسن تھے اور اس کا نام ہے ــــ سحرالبیان! یہ مثنوی جو اپنی ہیروئن کے نام کی مناسبت سے "بدرِ منیر" بھی کہلاتی ہے اردو ادب کی تاریخ میں سب سے نمایاں اور اہم ترین مقام کی حامل ہے۔ زبان کی سلاست، خیالات کے تسلسل، اظہار کی شگفتگی اور جذبات کی کامیاب عکاسی کی بنا پر ہر دور کے نقادوں سے اس نے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ بس! آپ اِس مثنوی کے مطالعہ کرنے کا ارادہ کرلیں۔ خواہ اسے آپ کسی نسخہ کی "دوا" سمجھ کر ہی کیوں نہ پڑھیں اور پڑھنے میں دم ہی کیوں نہ

نکل جائے مگر آپ اسے ضرور پڑھیں ـــــ چلیں! آپ یہ بھول جائیں کہ یہ شاعری ہے ۔ آپ اسے کہانی اور اس کے پس منظر کی صورت میں پیش کیے گئے ماحول کی خاطر ہی پڑھ لیں ـــــ جب آپ اسے ختم کر لیں تو پھر اس کے بعد خود سے یہ سوال کریں کہ کیا اب بھی آپ شاعری کو ناپسند کرتے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اکیلی مثنوی (جو بہت زیادہ طویل نہیں) آپ میں شاعری کے خوابیدہ ذوق کو بیدار کر دے گی اور اس کے بعد آپ ولی، مصحفی، آتش، میر، غالب، مومن، حسرت اور فانی وغیرہ کے کلام سے بھی لطف اندوزی کے قابل ہو جائیں گے۔

لیکن میں آپ کی ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہتا ہوں ۔ اگر آپ مشاعرہ میں شعر "سن" کر داد کے ڈونگرے برسا کر چلے آتے ہیں تو آپ ہرگز ہرگز بھی اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ آپ میں شعر فہمی کا صحیح مذاق ہے ۔ مشاعرہ میں ماحول بالکل جداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے ۔ ایک شاعر (اگر شاعرہ ہو تو اور بھی زیادہ) جب "ترنم" (بلکہ بعض کی صورت میں باقاعدہ سُر تال) کے ساتھ "غزل گو" نہیں بلکہ "غزل سرا" ہوتا ہے تو آپ واقعی جھوم جھوم جاتے ہیں ۔ لیکن اس میں الفاظ کے آہنگ ، اور صوتی تاثر کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے اور اکثر بیت ایسی ہوتی ہے جو شعر کے مفہوم سے ناآشنا رہتے ہوئے آواز کے زیر و بم پرست ہو جاتی ہے ، اکثر لوگوں نے اس فرق کو محسوس کیا ہو گا جو مشاعرہ میں غزل سننے اور اسے کسی رسالہ میں پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے ـــــ تو صاحب! میرے کہنے کا یہی مطلب ہے کہ اگر آپ شعر فہمی اور اسی کا ذوق پیدا کرنے کے لیے مشاعروں کا رُخ کرنے کا سوچ رہے ہوں تو اس ارادہ

کو ملتوی کر دیں — اور پھر اس سے ہفتہ کی تین شاموں کے نوّے منٹوں والی شرط بھی تو ادھوری رہ جاتی ہے۔

لیکن اگر آپ شاعری پر مقالات اور مثنوی پڑھنے کے بعد بھی خود کو شاعری کے ذوق سے نابلد ہی پاتے ہیں تو چھوڑیئے اس کا خیال! آپ تاریخ اور فلسفہ کی طرف رجوع کر دیکھیں۔ گو مجھے اس کا افسوس ہے کہ آپ کی طبیعت شاعری سے میل نہ پیدا کر سکی۔ لیکن کوئی بات نہیں! آپ تاریخ کو آزما دیکھیں — اور یوں تاریخ — آپ کے سامنے قدیم عظمتوں کے مٹے مٹے نقوش کو دوبارہ اُجاگر کر دے گی۔ اس طرح فلسفہ کے مطالعہ سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ کاروانِ دانش کن کن مراحل سے گزرا ہے۔ انسان نے کس کس دور میں کیا کیا سوچا — اور اس سوچ نے آنے والے دانش وروں کو کس انداز سے متاثر کیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ شروع میں ان کی "خشکی" سے آپ کو جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی۔ لیکن مجھے توقع ہے کہ اگر آپ نے مستقل مزاجی کا دامن نہ چھوڑا تو آپ جلد ہی اس کے لیے دلچسپی محسوس کریں گے اور پھر ویسے بھی ذہنی لحاظ سے اوسط درجہ والا ہر آدمی سال کے مسلسل مطالعہ کے بعد اس قابل ہو سکتا ہے کہ وہ عظیم فلسفہ دانوں یا مورخین کی اصل کتابوں کا مطالعہ کر سکے۔ یا تو آپ کا محض خیال ہے کہ فلسفہ مشکل ہے یا تاریخ خشک ہے۔ نہ کوئی چیز مشکل ہوتی ہے اور نہ ہی خشک! بس اس کے متعلق اپنا اندازِ نظر بدلنا ضروری ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد آپ کے لیے وہ خشکی ہی مزید تحریک کا باعث بن کر مشکل پسندی کو جزوِ طبیعت بنا دیتی ہے۔

میں آغاز کے لیے کسی کتاب کا نام نہ لوں گا۔ کیونکہ اس مختصر سی کتاب کے صفحات اِس نوعیت کی فہرستوں کے متحمل نہ ہو سکیں گے اور پھر میں آپ کو پابند بھی نہیں کرنا چاہتا، اس لیے انتخاب کتب میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ لیکن پھر بھی میں عمومی اہمیت کی دو ہدایات ضرور دوں گا۔ اوّل —— آپ اپنی سعی کے لیے حدود اور خطوط مقرر کر لیں۔ آپ تھوڑا وقت لیں اور اس تھوڑے وقت کے لیے کسی واحد مصنف یا مختصر سے موضوع کا انتخاب کریں۔ مثلاً —— آپ خود سے یوں کہیں : میں شاہ جہاں کے عہدِ حکومت کے بارہ میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ یا —— پاکستان میں ریلوے نظام کے بارہ میں حصولِ معلومات —— یا —— مولانا حسرت موہانی کی زندگی سے واقفیت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ اِس مقصد کے لیے آپ پہلے سے وقت کا تعین کر لیں۔ اِس دوران میں اِدھر اُدھر کی دلچسپیوں اور ذہنی ٹامک ٹوئیوں سے محترز رہ کر خود کو اپنے پسندیدہ موضوع تک محدود رکھیں اور اللہ کا نام لے کر مطالعہ شروع کر دیں! کچھ عرصہ بعد آپ اِس مسرت سے آشنا ہو جائیں گے جو کسی مخصوص موضوع کا "خصوصی ماہر" ہونے سے وابستہ ہے۔

دوم —— آپ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اِس پر سوچنے کی عادت بھی ڈالیں۔ میں بعض ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو مطالعہ کے شوقین بھی ہیں اور جو خوب مطالعہ کرتے ہیں۔ مگر کیونکہ اِس پر غور و فکر کے عادی نہیں اس لیے میرے نزدیک اِن کا مطالعہ ایسے ہے جیسے ڈبل روٹی سے توس کاٹنا، سائیکل صاف کرنا یا پیاز کاٹنا —— اِن کے مطالعہ میں اِتنا اہتمام بھی نہیں جتنا بعض لوگ چائے نوشی

کے لیے کرتے ہیں۔ وہ تو ادب کی گلیوں سے اس تیز رفتاری سے گزرتے ہیں۔ جیسے موٹر کار پر سوار ہوں۔ ان کا تمام مقصد تیزی ہوتا ہے اور وہ آپ کو بڑے فخر سے بتائیں گے کہ انھوں نے ایک سال میں کتنی کتابیں پڑھیں ہیں۔ حالانکہ "بندوں" کی طرح کتابیں بھی "گننے" کی نہیں بلکہ "تولنے" والی چیز ہیں۔

اگر آپ شام کو مطالعہ کے لیے وقف شدہ نوّے ۹۰ منٹوں کو گزارنے کے بعد اپنے پڑھے ہوئے مواد پر پینتالیس ۴۵ منٹوں کے لیے غور نہیں کرتے (مجھے اس کا احساس ہے کہ شروع شروع میں یہ کام بہت زیادہ اکتا دینے والا محسوس ہوگا) تو آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کا یہ ڈیڑھ گھنٹہ ضائع گیا ہے۔ اگر آپ صرف پڑھتے گئے اور اس پر بعد میں نہ سوچا تو نتائج کے اعتبار سے آپ کی رفتارِ ترقی نسبتاً ہلکی رہے گی۔

بعض خطرات

اس کتاب میں بھرپور زندگی سے معمور ہو کر " زندہ " رہنے کے نقطۂ نظر سے وقت گزارنے کے لیے (جو عام لوگوں کی زندگی بسر کرنے کے انداز سے متمیز ہے) جو تجاویز اور مشورے دیئے گئے ہیں گو ان میں کسی باضابطہ نظام اور ترتیب کا فقدان نظر آتا ہے، پھر بھی میں اسے بعض خطرات کی طرف نشان دہی کیے بغیر ختم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ وہ خطرات ہیں جو سرگرم زندگی گزارنے کے جذبہ کے تحت خلوص سے سعی کناں حضرات کو عموماً پیش آتے رہتے ہیں۔

ان میں سب سے نمایاں اور عظیم خطرہ وہ ہے جس میں انسان ہر معاملہ میں اپنی علمیت کا رعب جھاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کا انسان اپنے اس جذبہ کی بنا پر عام لوگوں پر ایک اچھا خاصا بوجھ بنا رہتا ہے۔ کیونکہ اس کے ایک ایک انداز سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ عقل و دانش اسی پر آ کر ختم ہو گئی ہے اب وہ خواہ درحقیقت " لال بجھکڑ " ہی کیوں نہ ہو مگر وہ ہر معاملہ میں اپنی ٹانگ

ضرور اڑانے کی کوشش کرے گا۔ یہ جذبہ جب زیادہ شدید صورت اختیار کر جائے تو انسان کا کام ہی یہی رہ جاتا ہے کہ وہ موقع اور محل کے بغیر ہی لوگوں پہ اپنی علمیت کا رعب ایک دری کی گرد کی مانند ـــ جھاڑتا رہے۔ اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ بزعم خود جب وہ ایک "انکشاف" کرتا ہے تو وہ اس کا ڈھنڈورا پیٹنے نکل پڑتا ہے اور اگر لوگوں کو پہلے ہی اس "انکشاف" کے بارہ میں پتہ ہو تو اسے اس بات سے سخت کوفت ہوتی ہے کہ تمام دنیا اس سے متاثر کیوں نہیں ہوئی۔ اور یہ ایسا رجحان ہے جو بڑی آسانی سے مگر لاشعوری طور پر آپ کے ـــ اور ہر انسان کے ذہن میں جڑ پکڑ سکتا ہے۔ کیونکہ ایک نئی بات معلوم کر کے فطری طور سے ہی انسان اسے دوسروں کے روبرو لانے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے احباب کو اس بات سے نہیں ـــ بلکہ اپنے آپ سے ـــ متاثر کرنا چاہتا ہے۔

جب ایک آدمی اپنے وقت کو صحیح طریقہ سے خرچ کرنے کی مہم کا آغاز کرتا ہے تو اسے یہ بھی احساس کر لینا چاہیے کہ وہ صرف اپنے ہی وقت کا مالک ہے۔ اور اسے اپنی بلند پایہ معلومات سے دوسروں کے قیمتی وقت پر بار بننے کا حق نہیں پہنچتا ہے۔ آپ کو تو صرف اپنے ہی وقت کا میزانیہ تیار کرنا ہے۔ اس میں دوسروں کے وقت کو شامل کرنے کی کوشش نہ کریں اور پھر آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اس میزانیہ کی تیاری سے پہلے بھی زمین بہت اطمینان اور سکون سے گردش لگاتی رہتی تھی اور آپ خواہ اپنے وقت کے اس سٹیٹ بنک کے مکمل انتظام میں کامیاب ہوں یا ناکام ـــ

زمین پھر بھی اسی طرح سے گردش کناں رہے گی۔ اس لیے آپ کی اور دوسروں کی بھی —— بہتری اسی میں مضمر ہے کہ آپ جو کچھ کر رہے ہوں اسے خود تک ہی محدود رکھیں۔ اس طرح اگر تمام دنیا اپنے قیمتی وقت اور سنہری گھڑیوں کو ضائع کر رہی ہے تو آپ کو اس پہ ماتم کناں ہونے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ آپ اپنی زندگی کی فکر کریں۔ آپ کو کیا پڑی کہ آپ اپنے پڑوسی کے گھر یہ دیکھنے کے لیے جھانکیں کہ وہ صحیح معنوں میں زندگی گزار رہا ہے کہ نہیں؟ اگر آپ صحیح معنوں میں اپنے وقت کے میزانیہ کو ترتیب دینے کے بعد اس پر مکمل طور سے عمل پیرا ہو گئے تو جلد ہی آپ کو یہ احساس ہو جائے گا کہ آپ کے پاس اتنا فالتو وقت ہی نہیں جس سے آپ دوسروں کے معاملات میں دخل اندازی کر سکیں۔

دوسرا خطرہ یہ ہے کہ آپ اپنے لائحہ عمل کی پابندی میں کولھو کے بیل نہ بن کر رہ جائیں۔ یاد رکھیں! آپ کا لائحہ عمل آپ ہی کی تخلیق ہے وہ آپ کا ہمزاد نہیں ہے نہ ہی اسے خود پر یا اپنے اعصاب پر مسلط کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لائحہ عمل پر آپ ہی نے عمل پیرا ہونا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اسے کسی دیوتا کی طرح ایک شہ نشین پر براجمان کر کے ہر وقت اس کے حضور ہاتھ باندھے کھڑے رہیں۔ آپ پر اپنے لائحہ عمل کا احترام واجب ہے۔ لیکن یہ پانچ نمازیں نہیں کہ جن کی عدم ادائیگی پر آپ سے مواخذہ کیا جائے گا۔

میرے خیال میں یہ تو بالکل واضح اور سیدھی سادی سی بات ہے!——

لیکن اس کے باوجود میں بعض ایسے اصحاب سے واقف ہوں جن کی زندگیاں نہ صرف ان کے لیے ہی بلکہ ان کے دوست، احباب، افرادِ کنبہ اور دیگر رشتہ داروں کے لیے محض اسی بنا پر اچھا خاصا بوجھ بن گئیں کہ وہ اس "بالکل واضح اور سیدھی سادی سی بات" کو نہ سمجھ پائے۔ دیکھیئے! کہیں آپ بھی تو ایسے نہیں ——— کہ کسی جگہ مدعو کیے جانے کی صورت میں آپ کی بیوی کو یہ جواب دینا پڑے :

"دراصل مُنّے کے ابا کھانے کے بعد ٹھیک آٹھ بجے چہل قدمی کرتے ہیں اور پونے نو بجے وہ مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس لیے یہ تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ہم دونوں ———" وغیرہ وغیرہ۔

اگر اتفاق سے آپ ایسے ہی ہیں تو بے فکر رہیئے کہ آپ کی بیوی کے لہجہ میں جو "قطعیت" پائی جاتی ہے وہی اس المناک اور ساتھ ساتھ مضحکہ خیز حقیقت کی غماز ہے کہ آپ زندہ رہ کر زندگی گزارنے میں ناکام رہے ہیں۔

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اپنے لائحہ عمل کو کوئی اہمیت ہی نہ دیں۔ کیونکہ اگر آپ نے اس پر کاربندی نہیں ہونا تو سرے سے اس کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور یہ ایک لائحہ عمل نہیں بلکہ ایک قسم کا مذاق بن کر رہ جائے گا۔ بس آپ اپنے انداز و اطوار میں صحیح قسم کی لچک پیدا کر لیں۔ آپ اپنے لائحہ عمل اور دُنیا کے دیگر تقاضوں اور ذمہ داریوں کے درمیان ایک خوشگوار توازن پیدا کر لیں ——— نہ تو آپ "گُل محمد" بنیں کہ خواہ "زمین جنبد" کر جائے مگر وہ "نہ جنبد" ہوگا۔ اور نہ ہی شاخِ گل بنیں ——— کہ جب ہَوا کا معمولی سا

چھوٹا بھی جدھر چاہے موڑ سکے۔ کسی ناتجربہ کار کو یہ توازن اور یہ لچک پیدا کرنا گو آسان معلوم ہو، مگر صرف تجربہ ہی یہ واضح کرے گا کہ یہ اتنا سہل نہیں ہے۔

تیسرا خطرہ اس رجحان کی صورت میں ظاہر ہوگا جس کے تحت انسان کے ذہن پر کیے جانے والا کام ایک بھوت کی مانند سوار ہو جاتا ہے۔ اس رجحان میں بتدریج ارتقا پذیری ہوتی ہے۔ اس کی انتہائی اور شدید صورتوں میں یہ نتیجہ نکلے گا کہ یہ رجحان انسان کے لیے ایک قسم کا ذہنی زندان ثابت ہوتا ہے، اور انسان اپنی زندگی کا مالک ہوتے ہوئے بھی اس پر قادر نہیں رہتا ہے۔ آپ ٹھیک آٹھ بجے سیر کے لیے جاتے ہیں۔ مگر ایسی سیر کس کام کی کہ آپ کے ذہن میں تو یہ خیال کلبلا رہا ہے کہ پونے نو بجے جا کر فلاں کتاب کا مطالعہ کرنا ہے۔ اب آپ کی سیر اچھی خاصی بیگار بن جائیگی۔ آپ دیر نہ ہو جانے کے احساس کی وجہ سے بار بار گھڑی دیکھیں گے۔ آپ سیر کے وقت راستہ کی کسی چیز میں دلچسپی نہ لے سکیں گے۔ کیونکہ آپ کے ذہن میں تو مطالعہ کیے جانے والی کتاب کے صفحات پھڑپھڑا رہے ہیں۔

اگر آپ کا لائحہ عمل آپ پر بوجھ ثابت ہو رہا ہے تو اسے ہلکا کرنے کے لیے جان لوجھ کر اس کی کسی شق پر عمل پیرا نہ ہونے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آپ ٹھنڈے دل سے تمام لائحہ عمل کا جائزہ لیں — کہیں آپ نے اس میں بہت کچھ تو نہیں ٹھونس رکھا؟ میرا اپنا یہی خیال ہے۔ اگر آپ مستقل طور سے اپنے لائحہ عمل پر کاربند رہیں تو اس سے آپ کبھی بھی بوجھ نہ

محسوس کریں گے۔ ساری گڑبڑ تو وہاں شروع ہوتی ہے جب آپ اپنی سکت سے زیادہ کام رکھ لیں۔ انسان شروع شروع میں زیادہ گرم جوشی سے کام لیتے ہوئے بڑے بڑے عزائم کرتا ہے۔ اس لیے آپ اپنے لائحہ عمل پر نظرِ ثانی کریں اور آپ دیکھیں گے کہ اس میں کئی ایسے کام آ گئے ہیں جو آپ باسانی نکال سکتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے آپ کی استعداد میں اضافہ ہوتا جائے آپ اس میں اضافہ کرتے جائیں۔

حصولِ علم کے جذبہ کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس کی طلب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جیسے جیسے آپ اس کی تسکین کے لیے نئے نئے سامان بہم پہنچاتے جائیں گے۔ ایسے ہی اس کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور بعض انسانوں کی تو یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اس ضمن میں اُن کی تمام زیست ہی ایک سعیٔ مسلسل بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسے آدمیوں کے لیے لاعلمی کے اندھیرے میں اونگھتی ہوئی زندگی بسر کرنے سے

پئے علم چوں شمع باید گداخت

کی زندہ تصویر بن جانا کہیں زیادہ بہتر ہے۔

بہرحال! اگر یہ لائحہ عمل زیادہ معلوم ہوتا ہے اور اس کے باوجود بھی آپ اس میں تغیر پذیری کے متمنی نہیں ہیں تو اسے مستقل طور سے اپنائے رکھنے کے لیے میں ایک ترکیب بتائے دیتا ہوں۔ آپ جب لائحہ عمل کی ایک شق سے دوسری شق کی طرف رجوع کر رہے ہوں تو اس تبدیلی کے احساس کے ساتھ ایسا کیجئے۔ مثلاً سیر کے بعد اگر پونے نو بجے آپ نے کتاب کھولنی

ہے تو اِس سے قبل پانچ منٹوں کے لیے بالکل خالی الذہن ہو جائیں۔ بالفاظِ دیگر ـــ آپ شعوری طور سے پانچ منٹ ضائع کرنے کے نظریہ سے اپنے پانچ منٹ ضائع کریں۔

اب ہم آخری مگر اہم ترین خطرہ کا جائزہ لیتے ہیں۔ ویسے میں پہلے بھی اس کا تذکرہ کر چکا ہوں اور وہ اس ناکامی کا خطرہ ہے جو ایسے کاموں کے آغاز میں ہی انسان کا منہ چڑا دیتی ہے ـــ مگر آپ کیوں کہ اس سے دامن نہیں بچا سکتے ہیں اور اِس لیے میں اس پہ مصر ہوں۔

آغاز پہ ہی ناکامی سے دوچار ہونے کی صورت میں آپ بہت جلدی ہی دل برداشتہ ہو سکتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک نیا جنم لینے کی جو نئی نئی تحریک آپ میں اُبھری تھی اس کا گلا گھُٹ جاتا ہے۔ اِس لیے اس سے بچنے کے لیے ہر ممکن احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ اپنی اِس تحریک پہ اتنا زیادہ بار نہ ڈالیں کہ یہ اس کی تحمل نہ ہو سکے۔ آپ چھلانگ لگانے سے قبل یہ دیکھ لیں کہ جو معیار اپنے سامنے رکھا ہے وہ آپ کی استعداد سے زیادہ تو نہیں ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ کو جان بوجھ کر اپنے لیے اپنی استعداد سے بھی کم معیار مقرر کرنا چاہیے ـــ لیکن ایک دفعہ جب آپ اپنے لیے ایک معیار مقرر کر لیں تو پھر اس سے انحراف نہ کریں اور جو لائحہ عمل مرتب ہو جائے حتی الامکان اس کی پابندی کریں۔

اس طرح جب اپنے لیے ایک مقصد یا نصب العین (اس کا بہت زیادہ ارفع ہونا ضروری نہیں) رکھ لیں تو پھر آپ کو ہر قیمت اور قربانی پہ

اس کی تکمیل کرنا ہو گی۔ آپ اس سے اکتاہٹ محسوس کریں گے۔ آپ پر بوریت سوار ہو گی اور بعض اوقات آپ بد مزگی بھی محسوس کریں گے۔ مگر آپ کچھوے کی چال چلتے جائیے اور یقین مانیے! جب اس بور اور اکتا دینے والے کام کو آپ سرانجام دے لیں گے تو اس کے نتیجہ میں آپ میں خود اعتمادی کی ہو نئی لہر دوڑ جائے گی۔ اس سے وابستہ خوشی اور مسرت کی گمبھیر کیفیات سامنو ل ہوں گی۔

ایک بات اور ـــــ شام کے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے جب کام کا چناؤ کریں تو اس میں عام روش پر چلنے کی کوشش کرتے ہوئے ایسے کام کو نہ چن لیں جو آپ کی طبیعت سے میل نہیں کھاتا ہے۔ اس ضمن میں آپ کا مشیر آپ کا ذوق ہے اور آپ کا راہنما آپ کی افتادِ طبع کسی دوست کے کہنے میں آکر رجحانِ طبع کے برعکس کسی چیز، کام یا موضوع کا انتخاب ہرگز نہ کریں۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان اگر فلسفہ کی چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا بنا ہو تو کیا ہی بات ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر آدمی کو فلسفہ کا مذاق نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے آپ فلسفہ کے نام سے خود مرعوب ہو کر یا دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے اس کا انتخاب مت کریں بلکہ اگر تاریخ سے دلچسپی ہے تو اس کی طرف رجوع کرنا زیادہ بہتر رہے گا۔

اختتامیہ

اصل کتاب ختم ہو چکی ہے!

کیونکہ آپ یہاں تک آ پہنچے ہیں اس لیے مجھے توقع ہے — اور یہ بے جا نہیں — کہ آپ اس اختتامیہ کو بھی ضرور پڑھیں گے۔ ویسے آپ بے فکر رہیں میں مزید پند و نصائح سے کام نہ لوں گا۔ کیونکہ آرنلڈ بینٹ نے جو لکھ دیا ہے مجھے اس میں مزید اضافہ کی خواہش نہیں ہے۔

یہ کتاب کیونکہ مغربی ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ترجمہ کرتے وقت ناموں اور واقعات کو اپنے ماحول سے بدلنا پڑا اور یہ ناگزیر بھی تھا — وہ کتاب — جس کا مصنف اسے ایک راہنما کا درجہ دیتے ہوئے پیش کرتا ہے۔ اگر وہ آپ اور آپ کے ماحول سے اجنبی اور بیگانہ ہو تو ایسی کتاب کے خریدنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں نے کتاب کو ہر ممکن انداز سے اپنے ماحول کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہوئے بھی کتاب کی اصل روح اور

مصنّف کے پیغام کو تبدیل نہیں ہونے دیا ہے۔

دوسری بات ـــــ اور جس کی وجہ سے مجھے یہ اختتامیہ تحریر کرنا پڑا ـــــ یہ ہے کہ بینٹ نے کیونکہ یہ کتاب مغربی ماحول کے لیے لکھی تھی اِس لیے اُنہوں نے وہاں کے دفتری اوقات کا ذکر کرتے وقت وہاں کا وقت لیا تھا۔ وہاں سارا سال ایک ہی وقت رہتا ہے۔ مگر ہمارے ہاں صورتِ حال مختلف ہے۔ یہاں سردیوں اور گرمیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ نظامِ اوقات مقرر ہیں۔ موسمِ سرما کے لیے تو آپ کو اپنے لیے لائحہ عمل مرتب کرتے وقت اتنی دقت نہ ہوگی اور آپ تقریباً تقریباً بینٹ کے وضع کردہ خطوط پر چل سکتے ہیں۔

مگر موسمِ گرما کی اور بات ہے!

آپ کا دفتر ساڑھے سات سے ڈیڑھ بجے تک ہوتا ہے۔ بظاہر تو آپ کے پاس کافی سے زیادہ وقت نظر آتا ہے۔ مگر بات وہی بینٹ والی ہے ـــــ کہ یہ کافی سے زیادہ وقت بھی چوبیس گھنٹوں اور سردیوں کا بظاہر تنگ اور "سُکڑا" ہوا وقت بھی چوبیس گھنٹوں پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ اِس لیے آپ نے اگر کچھ کرنا ہے تو وہ بھی اس وقت میں ہی ہوگا اور اگر اسے ضائع کرنا ہے تو وہ بھی یہی وقت ہے۔

آپ رات کو سیکنڈ شو دیکھنے گئے تھے اس لیے آپ صبح افراتفری میں اُٹھتے ہیں اور بھاگم بھاگ دفتر پہنچتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کاروبار کرتے ہیں یا دوکان کھول رکھی ہے تو پھر آپ ایسی جلدی سے کام نہیں لیتے بلکہ اطمینان سے اُٹھ کر اور بڑے سکون سے غسل اور ناشتہ کرنے کے بعد نو اور دس کے

درمیان آپ دوکان پر جلوہ افروز ہوں گے۔ ویسے بھی سیکنڈ شو دیکھے بغیر بھی لاہور کے اکثر دوکاندار ۹ سے پہلے دوکان نہیں کھولتے ہیں۔ ادھر کاروباری حضرات کے تو ٹھاٹھ ہی اور ہیں وہ کیونکہ اپنے وقت کی مانند اپنے کاروبار کے بھی مالک ہیں، اس لیے وہ اس معاملہ میں اتنے اہتمام کی حاجت نہیں محسوس کرتے ——— یہ تو ملازمین ہیں جو آدھ کھلی آنکھوں کے ساتھ جمائیاں لیتے بسوں اور سائیکلوں پر بھاگے جاتے ہیں۔

کیونکہ آپ رات کو دیر سے سوئے تھے (اس دیر کی سینما کے علاوہ اور بھی کئی وجوہات ہوتی ہیں) اور صبح آپ "کچی نیند" جاگے اس لیے تمام دن سستی اور گرانی میں گزرا ——— نتیجہ؟ آپ دوپہر کو کھانا کھا کر جو سوئیں گے تو شام کو جاگیں گے۔ اس کے بعد پھر وہی دور شروع ہوگا جس کا بینٹ نے رونا رویا ہے۔ لیکن آپ کا اعتراض ہے ——— اور یہ ایک حد تک بجا ہے ——— کہ ساری دوپہر سو کر گزارنے کے باعث لازمی طور سے سیر و تفریح کو دل چاہتا ہے اور پھر جب شام کو گھر سے نکلے تو کیا پتہ باہر جا کر دوستوں کے ساتھ کیا پروگرام بن جائے۔ ہوٹل میں گپیں مارتے ہی دس بج جائیں!

تو صاحب! آپ شام کی تفریح مت بند کریں! لیکن کم از کم تمام دوپہر خواب خرگوش میں بھی تو مت گزاریں۔ رات کو پوری نیند کے بعد تمام دوپہر سونے میں کوئی مصلحت نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کھانا کھاتے ہی غنودگی سی چھا جاتی ہے۔ مگر مجھے اس کا یقین نہیں ——— غنودگی کھانے کے باعث نہیں بلکہ زیادہ کھا جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ واقعی کھانے کے بعد غنودگی محسوس

کرتے ہیں تو پھر تھوڑا سا آرام کر لیں۔ لیکن سونا نہیں چاہیے۔ آپ آنکھیں بند کر کے بالکل چت لیٹ جائیں اس سے تمام جسم میں دورانِ خون ایک سا ہو جانے سے نہ صرف اعصاب ہی کو سکون ملے گا بلکہ تھکے ہوئے اعضا کو بھی آرام پہنچے گا۔ نرم بستر پر لیٹنے کی بجائے فرش پر دری بچھا کر لیٹنے سے آپ زیادہ جلد نارمل ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس طرح فرش کی سختی اور ٹھنڈک آپ کے لیے ایک قدرتی ٹانک کا کام کرتی ہے جو مضمحل اعصاب کو توانائی بخشے گی۔ لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں مگر سونے کے لیے نہیں بلکہ جلتی ہوئی آنکھوں سے جھلسے ہوئے پپوٹوں اور ان سے متعلقہ عضلات کو سکون پہنچانے کے لیے۔ پھر انہیں کھول دیں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے پتلیوں کو چاروں طرف گھمائیں۔ پھر انہیں بند کر لیں اور پھر کھول لیں۔ یہ آنکھوں کی ورزش ہے اور دس منٹ سے بھی کم مدت میں آپ کی آنکھوں کی تھکن دور ہو جائے گی۔ اسی مقصد کے لیے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے بھی بہت سودمند ثابت ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی ورزش جیسی ملتی جلتی "ورزش" آپ عضلات اور پٹھوں کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اعضا کی ورزش نہیں ہے اس لیے آپ کو کسی قسم کی بھاگ دوڑ یا کود پھاند کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔ بلکہ آپ کو ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلانے پڑیں گے۔ آپ سانس روک کر تمام جسم کو اکڑا لیں۔ دو تین سیکنڈ کے بعد سانس چھوڑ کر تمام جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ پھر ایک عام سا سانس لیتے رہیں۔ اس کے بعد پھر اس عمل کا اعادہ کریں۔ آپ کو جلد ہی اطمینان ہو جائے گا کہ [illegible]

اتنی آسان ہے اور نہ ہی اسے آپ زیادہ دیر تک کر سکیں گے --- اور یہ زیادہ دیر کے لیے ہے بھی نہیں۔

اگر آپ نے ایمانداری سے اِس عمل کو اپنایا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ دوپہر کو کام نہ کر سکیں۔ آپ ڈیڑھ بجے دفتر سے نکلے تھے --- راستے کے سفر، گھر آ کر غسل، کھانا اور اس کے بعد آرام کے لیے آپ کو دو گھنٹے دے دیتا ہوں۔ ساڑھے تین بجے آپ اپنے ڈیڑھ گھنٹے والے کام کو شروع کر سکتے ہیں۔ پھر کیونکہ آپ نے ہفتے میں تین دوپہروں میں کام کرنا ہے اس لیے باقی تین دوپہروں کے تو آپ ہی مالک ہیں۔ جیسے چاہیں انہیں گزاریں، لیکن نیند آنے کا اعتراض مت کریں۔ یہ آپ نے کیسے فرض کر لیا کہ گرمیوں کی طویل دوپہروں میں نیند کا آنا لازمی ہے۔ جب آپ کسی نئی فلم کے میٹنی شو میں جاتے ہیں تو ٹکٹ کھلنے سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے قطار میں کھڑے جلتے رہتے اور دھکم پیل کے بعد جب آپ سینما ہال میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں کے نسبتاً سرد ماحول، پنکھوں اور آرام دہ کرسیوں کی وجہ سے تو آپ کو کبھی نیند نہ آئی۔ اس وقت آپ کا سر بھی تھکن سے بوجھل بوجھل نہیں معلوم ہوتا اور نہ ہی آپ کو پٹھے اکڑے اکڑے معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ آپ بڑے اطمینان سے جوتے اتار کر سامنے والی سیٹ کے پچھلے حصہ پر پاؤں ٹکا کر بیٹھ جاتے ہیں اور فلم شروع ہونے کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔

اِس کتاب کے لکھنے کا یہی مقصد ہے کہ آپ میں تن آسانی کی وجہ سے وقت ضائع کرنے کی جو عادت پڑ چکی ہے اسے دور کیا جائے۔ اِنسان جب

کام کرنا چاہتا ہے تو وہ آگ کے دریا بھی عبور کر جاتا ہے۔ یہ تو گرمیوں کی دوپہر میں نیند روکنے کا مسئلہ ہے، یہ ٹھیک ہے کہ نیند سُولی پر بھی آجاتی ہے۔ مگر معاف کیجئے! آپ کون سی سُولی پر ٹنگے ہیں۔ آپ تو اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے ہیں۔ غسل کرنے سے آپ تازہ دم ہو چکے ہیں اور کھانے سے آپ کے معدہ کی آگ بجھ چکی ہے۔ آپ نے کافی دیر سستا بھی لیا ہے ــــ ایک انسان کے لیے ــــ ایسا انسان جس کے سامنے کوئی مقصدِ حیات ہو ــــ اتنا بہت کافی ہے۔ ادھر دیکھیئے! گھڑی ساڑھے تین بجا رہی ہے، اُٹھیئے اور کچھ کام کر دکھایئے۔

ڈیل کارنیگی ——— مترجم شاہد حمید

پریشان ہونا چھوڑیئے جینا شروع کیجئے

(HOW TO STOP WORRYING AND START LIVING)

پریشانی اس وقت دنیا میں شخصی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ مالی پریشانی، جسمانی، ذہنی، روحانی پریشانی ——— کاروبار، اولاد، جنس، بڑھاپا ——— ہر طرح کی پریشانی ہر کوئی جانتا ہے کہ پریشان ہونا غلط اور مضر ہے، خطرناک ہے، ہر کوئی جانتا ہے کہ پریشانی صلاحیتوں کو بے رس کر دیتی ہے، ذہن کو دھندلا دیتی ہے، آرزو کا خون کر دیتی ہے، لیکن ہر کوئی یہ نہیں جانتا کہ پریشانی سے چھٹکارا کیسے کریں۔ دنیا کی سب سے اثر انگیز کتاب ”میٹھے بول میں جادو ہے“ کے مصنف ڈیل کارنیگی نے سات سال کی مسلسل عرق ریزی کے بعد پریشانی سے نجات پانے کا راستہ ڈھونڈا ہے۔ اس نے ہر پریشانی دور کرنے کے لیے ایسی صداقتیں ڈھونڈی ہیں جن پر فوراً عمل شروع کیا جا سکتا ہے اور جو عمر بھر بہترین نتائج کا ذریعہ ثابت ہوتی ہیں۔ اس نے آزمودہ طریقوں سے ثابت کر دیا ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں پریشانی پر فتح پائی جا سکتی ہے۔

پریشان ہونا چھوڑیئے ایک ایسی کتاب ہے جو آپ کی زندگی کا رُخ پلٹ سکتی ہے ——— تاریک رُخ کی بجائے روشن رُخ کو سامنے لا سکتی ہے۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات: مجلد ایڈیشن بارہ روپے ——— میری لائبریری سات روپے پچاس پیسے

ڈیل کارنیگی ——— مترجم کمال احمد رضوی

میٹھے بول میں جادو ہے

(HOW TO WIN FRIENDS AND INFLUENCE PEOPLE)

اس کتاب کی پچاس لاکھ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں

کروڑوں انسانوں نے اس کتاب سے روشنی پائی ہے گمنامی کے اندھیروں سے نکلے ہیں اور شہرت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

یہ کتاب بارہ طریقوں سے آپ کی مدد کرتی ہے

(۱) آپ میں نئے خیالات نئے نظریات اور نئے ارادے موجزن ہو جائیں گے۔ (۲) لوگ آسانی اور جلدی سے آپ کے دوست بننے لگیں گے۔ (۳) آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ (۴) لوگوں کو ہم خیال بنانے میں آپ آسانی محسوس کریں گے۔ (۵) لوگوں سے کام لینے کی اہلیت، آپ کے اثر و رسوخ اور ساکھ میں اضافہ ہو جائے گا۔ (۶) آپ اپنے پرانے اور نئے معاونین کے لیے کشش کا باعث بن جائیں گے۔ (۷) آپ کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ (۸) آپ پہلے کے مقابلہ میں بہتر منتظم بن جائیں گے۔ (۹) لوگوں سے خوشگوار اور ہموار تعلقات قائم رکھنے میں دقت پیش نہ آئے گی۔ (۱۰) بہتر مقرر بننے میں مدد ملے گی، آپ کی گفتگو میں لوگ دلچسپی لیں گے۔ (۱۱) روزمرہ کی زندگی میں نفسیات کے اصول برتنا آسان ہو جائے گا۔ (۱۲) آپ اپنے ساتھیوں میں نئے ولولے اور نئی امنگیں پیدا کر سکیں گے۔

لکھائی چھپائی عمدہ۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ مجلد ایڈیشن بارہ روپے ——— میری لائبریری ۵۰/۷ روپے

ڈیل کارنیگی ——— مترجم جاوید شاہین

گفتگو اور تقریر کا فن

(ON THE PUBLIC SPEAKING)

ڈیل کارنیگی دنیا میں فنِ تقریر کا مسلمہ استاد تھا۔ یہ کتاب اس کے علم کا نچوڑ ہے اور اردو ہی نہیں انگریزی میں بھی سلاست اور جامعیت کے اعتبار سے بے مثال ہے اس کے مطالعہ سے آپ سننے والوں کی توجہ حاصل کر سکیں گے۔ اپنا مدعا بہترین الفاظ میں بیان کر سکیں گے۔ تقریر یا بات چیت کو مناسب ترین مقام پر ختم کیا کریں گے اور یوں اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب

ساکریں گے ——— ظاہر ہے جو شخص دوسروں کا دل اپنی باتوں سے موہ سکتا ہے، انہیں قائل اور متاثر کر سکتا ہے۔ زندگی کی کامیابیاں اس سے کیسے دور رہ سکتی ہیں۔ ضخامت ۳۱۲ صفحات: قیمت ۴/۵۰ مجلد ۸/۰۰ روپے۔

نئی کتاب: اننتالیس بڑے آدمی۔ قیمت ۶/۵۰ روپے پچاس پیسے۔ مجلد ۱۰/۰۰ روپے۔

مصنف ڈیل کارنیگی

مانیں نہ مانیں

مترجم
جاوید شاہین

(مصور)

جانے بوجھے لوگوں کی ڈھکی چھپی باتیں

LITTLE KNOWN FACTS ABOUT
WELL KNOWN PEOPLE

دنیا کے مشہور لوگوں کی زندگی کو ڈیل کارنیگی نے کس نظر سے دیکھا تھا ——— "مانیں نہ مانیں" کارنیگی کی مشہور کتاب کا پہلی دفعہ اردو ترجمہ ہوا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی امارت، شہرت، ناموری، جہانبانی اور خوبصورتی کے چرچے ہماری زبانوں پر جاری ہیں۔ لیکن ہم ان کے خدوخال سے بالکل لاعلم ہیں۔ یہ جانیئے اور دیکھئے

ضخامت ۲۸۸ صفحے۔ مجلد ایڈیشن ۱۲ روپے ——— میری لائبریری ۵/۵۰ روپے پچاس پیسے۔

کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں

(مصور)

ڈیل کارنیگی کا ایک اور شاہکار اردو میں پیش کیا گیا ہے۔ ایسی شخصیات جو قائل اور متاثر کرنے میں کمال رکھتی تھیں، ان کی زندگی کے سربستہ راز و واقعات عبرت و اصلاح کا مرقع۔

میری لائبریری میں ساڑھے ۶ روپے۔ مجلد ایڈیشن بارہ روپے

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

نفسیات اور عمل

(۲۳ مقالات کا مجموعہ)

اگر ہم روزمرہ پر حاوی ہو کر کامیاب اور ممتاز زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ہمیں وہ راستہ معلوم ہونا چاہیے جو ہمیں منزل تک لے جائے، یا پھر کوئی ایسا ہمدرد و ہم سفر ہونا چاہیے جو چپ چاپ ہماری خامیوں کی اصلاح کر دے۔ مشکل مقامات پر ہماری دستگیری کرے اور امید کی روشنی سے ہمارے دلوں کو منور رکھے، یہ کتاب یہ سب کام کرتی ہے، اس کے مطالعے سے ہمیں اپنے روزمرہ کو سدھارنے کا، نیز کاروبار یا ملازمت میں دن دونی ترقی کرنے کا ڈھنگ معلوم ہوتا ہے اور ہمارے طریقِ کار اور اندازِ نظر کی اصلاح کی داغ بیل بھی پڑتی ہے۔

عمدہ کاغذ۔ مجلد ایڈیشن چھ روپے —— میری لائبریری دو روپے پچاس پیسے

پروفیسر محمد طاہر ایم۔ اے

روزمرہ نفسیات

اپنے ماحول اور حالات کے مطابق یہ کتاب ہماری روزمرہ کی زندگی کے کام کاج اور ہمارے اجتماعی تعلقات کے متعلق ہے، مصنف نے ہمارے رہنے سہنے، گفتگو، مہمانداری، ازدواجی زندگی میں خوبصورتی اور ضبط و نظم پیدا کرنے کے لیے نہایت مفید مشورے دیئے ہیں اور یہ مشورے قابلِ قبول بھی ہیں اور قابلِ عمل بھی۔ یہ کتاب آپ کو خود اپنی اور ماحول کی نگاہوں میں ممتاز اور قابلِ فخر بنا دے گی۔

عمدہ کاغذ مجلد ایڈیشن چھ روپے —— قیمت تین روپے

زندگی کے موڑ پر

(چالیس منتخب سچی آپ بیتیاں)

یہ آپ بیتیاں اردو کے مشہور ہفت روزہ "نصرت" میں شائع ہو چکی ہیں اور ناشر کا دعویٰ ہے کہ بے حد مقبول بھی ہوئی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ان آپ بیتیوں میں بعض ایسی ہیں جو افسانے سے بھی زیادہ دلکش اور دلفریب ہیں۔ پڑھنے والے کے لیے اس میں دلکشی کے بڑے سامان موجود ہیں چونکہ یہ دار دہائیں عام لوگوں کی آپ بیتیوں پر مشتمل ہیں، اس لیے ان میں تحریر کی شگفتگی اور سادگی بھی موجود ہے۔ پیشہ ور ادیبوں کے مقابلے میں ان میں بیان کی لطافتیں تو کم ہیں لیکن ان کی ڈرامیٹکس بجائے خود ایک خوبی ہے۔ روزنامہ امروز لاہور

مجلد ایڈیشن چھ روپے ۔۔۔ میری لائبریری ۰۰/۳ روپے

(حکیم و ڈاکٹر) محمد نعمان ساجد (مؤلف)

ترقی کی راہیں

مایوسی اور مشکلات میں لمبی تان کر نہ سو جائیں، ہمت مردانہ سے قدم آگے بڑھاتے جائیں، فتح آپ کی ہے، آپ جو چاہیں بن سکتے ہیں۔ "ترقی کی راہیں" ایک ایسی کتاب ہے جو آپ کی ہمت بندھاتی ہے اور آپ کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا کر کے آزادانہ عمل کا راستہ بتاتی ہے۔

مجلد سفید کاغذ چھ روپے ۔۔۔ میری لائبریری تین روپے



یہ شخ

بہت پریشان

اصل میں آج کل زندگی اتنی پیچیدہ ہوگئی ہے کہ ہر شخص کبھی نہ کبھ

الی پریشانی، جسمانی، روحانی، ذہنی پریشانی کاروبار، اولاد، جنس، بڑھاپا، ازد

لیکن ہر شخص یہ نہیں جانتا کہ پریشانیوں سے چھٹکارا کیوں کر

دنیا کی سب سے مقبول کتاب : **میٹھے بول میں جادو ہے** کے مصن

ایک اور کتاب لکھی ہے

پریشان ہونا چھوڑیے — جینا شروع کیجیے

اس کتاب نے لاکھوں انسانوں کو اندھیروں سے نکال کر کامیابی اور مسرت سے ہمکنار کیا ہے

ناشر :- **مکتبہ میری لائبریری لاہور۲**

۲۵۶ صفحات ——— مضبوط کپڑے کی جلد ——— قیمت بارہ روپے

میری لائبریری میں قیمت ۵۰/۷ روپے

